اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جون ۲۰۲۴ء

مُدِیْر: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 Monthly Al Burhan June 2024

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

نمبر شمار	کتاب	صفحات
	عصری تعلیم کی اصلاح (اسلامی تناظر میں)	
۱	ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
۲	اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
۳	تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷
۴	یکساں قومی نصاب-خدشات و مضمرات	۲۰۸
۵	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے معلمین	۱۶۰
۶	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے طلبہ وطالبات	۴۸
۷	پنج سورہ مع پارہ عم (اُردو تفہیم)	۷۶
۸	ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت	۱۲۰
۹	اسلامی علوم میں تحقیق	۲۷۲
	طلبہ کی اسلامی تربیت	
۱۰	تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۲
۱۱	تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت-ہینڈ بک وگائیڈ	۱۶۰
	اصلاحِ دینی مدارس	
۱۲	ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
۱۳	نصابِ مدنیؒ	۴۰
۱۴	مدرسہ ڈسکورسز-مطالعہ وتجزیہ	۱۵۶
۱۵	اصلاحِ دینی مدارس	۳۵۲
	اسلامی تحریکیں	
۱۶	پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟	۲۴۰
۱۷	خاموش انقلاب ناگزیر ہے	۲۸۸
۱۸	عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور	۸۴
۱۹	نئی اصلاحی تحریک کی ضرورت	۷۲
	تزکیۂ نفس	
۲۰	اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳

نمبر شمار	کتاب	صفحات
۲۱	حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۲
۲۲	اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۵۶
۲۳	ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۹۲
۲۴	اسلام اور تعمیر سیرت	۴۰۴
	اسلام اور مغربی فکر وتہذیب	
۲۵	اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۶
۲۶	اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۶
۲۷	اسلام اور ردِّ فکرِ مغرب	۲۱۶
	تفہیم دین	
۲۸	مسلم نشاۃ ثانیہ-اساس اور لائحہ عمل	۴۰۰
۲۹	شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۴۸
۳۰	رزم حق وباطل	۸۰
۳۱	اسلام اور پاکستان	۳۰۰
۳۲	عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون	۲۵۰
۳۳	مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۶۷۶
۳۴	مقالاتِ امین (جلد دوم)	۶۴۲
	اللغة العربية	
۳۵	السلطة التشريعية _ دراسة مقارنة	۱۵۰
	English Books	
۳۶	Islamization of Laws in Pakistan	250
۳۷	Riyaz us Saliheen I & II	950
۳۸	Literal Translation of the Holy Quran Para 1-10	500

مکتبہ البرہان

136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

ای میل ermpak@hotmail.com

تدریس القرآن

سبق: ۵

قرآن حکیم کا ترجمہ سیکھنے کے لیے

(آیت: ۱۷-۲۰)

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ

اٰیاتُھا ۲۸۶ — رُکُوعَاتُھا ۴۰

مَثَلُهُمْ	كَمَثَلِ	الَّذِي	اسْتَوْقَدَ	نَارًا	فَلَمَّآ	اُردو واستعمال	
مثال ان کی	جیسے مثال	اس شخص کی	جس نے جلائی	آگ	پھر جب	مَثَلُهُمْ	مثال، امثلہ، تمثیل
ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب						نَارًا	نوری وناری مخلوق، انوار

اَضَآءَتْ	مَا حَوْلَهٗ	ذَهَبَ	اللّٰهُ	بِنُوْرِهِمْ	وَتَرَكَهُمْ	اَضَآءَتْ	ضوء فشانی، ضیاء الحق
روشن ہوگیا	ماحول اس کا	لے گیا	اللہ	نور ان کا	اور چھوڑ دیا ان کو	حَوْلَهٗ	ماحول، ماحولیات
اس کا اردگرد روشن ہوگیا تو اللہ ان کی روشنی لے گیا اور ان کو اندھیرے میں						تَرَكَهُمْ	ترک کرنا، تارکِ دنیا

فِيْ ظُلُمٰتٍ	لَّا	يُبْصِرُوْنَ ﴿17﴾	صُمٌّ	بُكْمٌ	عُمْيٌ	فَهُمْ	ظُلُمٰتٍ	ظلمت، ظلمات
اندھیروں میں	نہیں	وہ دیکھتے۔	بہرے	گونگے	اندھے	پس وہ	يُبْصِرُوْنَ	بصارت، بصیرت، بصیر
چھوڑ دیا اور وہ کچھ دیکھ نہیں پاتے۔ وہ گویا بہرے، گونگے اور اندھے ہیں اور							عُمْيٌ	تقلیدِ اعمیٰ (اندھی تقلید)

لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿18﴾	اَوْ كَصَيِّبٍ	مِّنَ السَّمَآءِ	فِيْهِ	ظُلُمٰتٌ	يَرْجِعُوْنَ	رجوع، مرجع، مراجعت
نہیں وہ لوٹیں گے	یا جیسے بارش	آسمان سے	جس میں	اندھیرے		
(حق کی طرف) نہیں لوٹیں گے۔ یا (ان کی مثال) آسمان سے برستی بارش جیسی ہے جس						

وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ	يَجْعَلُوْنَ	اَصَابِعَهُمْ	فِيْٓ اٰذَانِهِمْ	مِّنَ الصَّوَاعِقِ	بَرْقٌ	برقی رو، برقی آلات، برّاق
اور گرج اور بجلی	وہ ڈالتے ہیں	انگلیاں ان کی	اپنے کانوں میں	کڑک سے	يَجْعَلُوْنَ	جعلی، جعل سازی
میں اندھیرا اور اور گرج چمک ہو۔ کڑک سے ڈر کر کانوں میں انگلیاں ڈالتے ہیں۔						

حَذَرَ	الْمَوْتِ	وَاللّٰهُ	مُحِيْطٌ	بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿19﴾	يَكَادُ	مُحِيْطٌ	احاطہ کرنا، احاطہ، محیط
ڈرتے ہوئے	موت سے	جب کہ اللہ	احاطہ کرنے والا ہے	کافروں کا۔	قریب ہے		
موت کے ڈر سے جب کہ اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ قریب ہے							

الْبَرْقُ	يَخْطَفُ	اَبْصَارَهُمْ	كُلَّمَآ	اَضَآءَ	لَهُمْ	اَبْصَارَهُمْ	بصارت، بصیرت، بصیر
بجلی	چھین لے	بصارت ان کی	جب کبھی	اس نے روشنی کی	ان کے لیے		
کہ بجلی ان کی آنکھیں چھین لے جب کبھی روشنی ہوتی ہے تو وہ							بقیہ آخری صفحہ پر

مَشَوْا	فِيْهِ ۙ	وَاِذَآ	اَظْلَمَ	عَلَيْهِمْ	قَامُوْا ؕ	مَشَوْا	مشائین
چلتے ہیں	اس میں	اور جب	اندھیرا کرتی ہے	ان پر	وہ کھڑے ہوجاتے ہیں	اَظْلَمَ	ظلمت، ظلمات
اس میں چل پڑتے ہیں اور جب اندھیرا ہو جائے تو کھڑے رہ جاتے ہیں						قَامُوْا	قائم، قیام، قیامت

وَلَوْ	شَآءَ	اللّٰهُ	لَذَهَبَ	بِسَمْعِهِمْ	وَاَبْصَارِهِمْ ؕ	شَآءَ	ان شاء اللہ، ماشاء اللہ
اور اگر	چاہتا	اللہ	ضرور لے جاتا	سماعت ان کی	اور بصارت ان کی	بِسَمْعِهِمْ	سماعت، سامعین، سامع
اگر اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت چھین لیتا۔							

اِنَّ	اللّٰهَ	عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ	قَدِيْرٌ (20)		قَدِيْرٌ	قدرت، قادر، مقدور
بے شک	اللہ	ہر چیز پر	قدرت رکھنے والا ہے۔			
بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔						

اہم نکات

مشکل الفاظ کے معانی

۱۔ مَا حَوْلَهٗ: اردو میں 'ماحول' ایک لفظ ہے جو عربی کے دو لفظوں مَا اور حَوْلَ سے مل کر بنتا ہے۔

۲۔ کَافِرٌ: کا لفظی معنی ہے انکار کرنے والا۔ غیر مسلموں کو کافر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ حق یعنی اسلام کا انکار کرتے ہیں۔

۳۔ یَجْعَلُوْنَ: (ج ع ل) یعنی بنانا، ڈالنا، کرنا۔ اردو میں غلط، غیر قانونی اور بری نیت سے کوئی چیز بنانے اور کام کرنے کے لیے جعلی اور جعل سازی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

مفہوم کا خلاصہ

۱۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے منافقین کا حال دو مثالوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ پہلی مثال میں کہا گیا ہے کہ ان منافقین کی مثال ایسے ہے کہ پیغمبر نے ہدایت کی آگ جلا کر روشنی پیدا کی لیکن ان کے نفاق کے سبب اللہ نے ان کی بصارت سلب کر لی اور وہ راہ راست دیکھنے سے محروم ہو گئے۔ اس پر مزید یہ کہ وہ بہرے، گونگے اور اندھے بھی ہیں۔ یعنی اپنے حقیر دنیاوی مفادات کے لیے ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں اور انہوں نے کفر پر جمے رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ گویا وہ آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھے ہیں کہ راہ حق ان کو نظر نہیں آتی۔ کان رکھنے کے باوجود بہرے ہیں کہ حق کی آواز سن نہیں پاتے اور گونگے ہونے کی وجہ سے حق کا نہ اظہار کر سکتے ہیں نہ کسی سے پوچھ سکتے ہیں۔ ۲۔ دوسری مثال اس شخص کی ہے جو اندھیری رات میں طوفانی بارش میں پھنسا ہوا ہو۔ بجلی چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں ڈرتا ہوا چند قدم اٹھاتا ہے اور چمک ختم ہوتی ہے تو کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہے۔ بجلی کے کڑکنے سے ڈر کر کانوں میں انگلیاں ڈالتا ہے حالانکہ کانوں میں اس طرح انگلیاں ڈالنے سے طوفان ٹل نہیں سکتا۔ ۳۔ منافقت دو طرح کی ہوتی ہے ایک یہ کہ آدمی دل سے اسلامی عقائد کو نہ مانتا ہو لیکن اس کا اظہار کرے اور دوسرے اللہ کے احکام کو سچا مانے لیکن ان پر عمل نہ کرے۔

حاصل کردہ سبق

۱۔ منافقت جس قسم کی بھی ہو اس سے بچو کہ اس کا نتیجہ گمراہی، دنیا میں ناکامی اور آخرت کی رسوائی ہے۔ ۲۔ اسلام کی سیدھی راہ پر چل کر جنت کی منزل تک پہنچنے کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ اخلاص سے دین قبول کرو اور اس پر عمل کرو نہ کہ نفاق اور منافقت سے اپنی راہ کھوٹی کرو۔

ماہنامہ البرہان لاہور
Since 2010
جلد ۲۸ شمارہ ۶
برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk
جون ۲۰۲۴ء/ ذی القعدہ ۱۴۴۵ھ

آئینہ مضامین

☜ مقالۂ خصوصی
- مغرب کی 'جدیدیت' اسلام میں 'جاہلیت' ہے — مدیر — ۴

☜ تعلیم و تربیت
- تسہیل القرآن — ۲۲
- سرسید کا پیغام اور مولانا نانوتویؒ کا جواب — مولانا اشرف علی تھانویؒ — ۲۴
- عربی تقریر و تحریر کا ملکہ کیسے پیدا کریں؟ — ڈاکٹر محمد اکرم ندوی — ۲۶
- انٹرنیٹ کا منفی استعمال: نقصانات اور ان سے بچنے کی تدابیر — مولانا محمد حنیف جالندھری — ۳۰
- مجلس علمی کراچی - ایک تعارف — ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین — ۳۵
- تربیت ضروری ہے یا تعلیم؟ — حافظ عمران طحاوی — ۳۸

☜ تفہیم دین
- مسلم معاشرے اور اسلامی سیکولرزم — ادارہ — ۴۲
- غامدی فکر کی بنیادی گمراہی کیا ہے؟ — مولانا یحییٰ نعمانی — ۴۴
- ادارتی قربانی کے مسائل — سید خالد جامعی — ۵۱

☜ اسلام اور مغرب
- عالمِ اسلام میں مغرب جیسی ترقی کیوں ممکن نہیں؟ — سید خالد جامعی — ۵۵
- مغربی تہذیب کے پیدا کردہ مسائل کا حل اسلام میں کیوں؟ — بلال احمد — ۶۳

☜ عالم اسلام
مسئلہ فلسطین - تاریخی پس منظر اور حقائق — ڈاکٹر شمس الحق حنیف — ۶۴

English Section — ۷۷
Certainty and Change in Capitalist Order
Dr. Javed Akbar Ansari

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ محمد عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0300-4107282)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے
سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے
تاحیات 20,000 روپے

تحریکِ اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

مقالۂ خصوصی

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

مغرب کی 'جدیدیت' اسلام میں 'جاہلیت' ہے

جب سے انسان اس دنیا میں آیا ہے 'اسلام' بھی موجود ہے اور اس کا انکار کرنے والی 'جاہلیت' بھی

مغرب کی دوسوسالہ فکری وعملی غلامی کے اثرات اتنے ہمہ گیر ہیں کہ مغرب کے روبہ زوال ہونے اور ہمیں اس کے جغرافیائی غلبے سے نکلنے کے تقریباً سو سال بعد بھی ہمارے اکثر حکمران اور کئی ''اہل دانش'' اور ''اسلامی سکالر'' بھی اس کے قبیح اثرات سے نجات پانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔ پچھلے دو سال میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کا شعبۂ اسلامی فکر وتمدن ''جدیدیت'' کو 'جدید' اور 'جدت' کہہ کر اسلامی ثابت کرنے کے لیے دو عالمی کانفرنسیں منعقد کرا چکا ہے اور لاہور میں ایک بزرجمہر نے تو اپنے ادارے کا نام ہی ''ادارہ فکر جدید'' رکھ دیا ہے اور وہ بھی اسی قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کی وجہ مغرب سے فکری مرعوبیت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم مغربی فکر وتہذیب سے اس مرعوبیت بلکہ مغرب کی فکری غلامی کے ''مرض'' پر پہلے بھی لکھتے رہے ہیں اور آج ایک دفعہ پھر بعض ''اہلِ علم'' کے ذہنوں پر پڑی جدیدیت کی یہ گرد جھاڑنے کی کوشش کریں گے، ان شاء اللہ۔

یاد رکھیے ہر زبان، مذہب، تہذیب میں عام الفاظ اور اصطلاحات میں فرق ہوتا ہے۔ یہاں ہر علم یا ہر شعبۂ علم میں کچھ الفاظ کے مخصوص معنی لیے جاتے ہیں اور اس کے سوا اس کے دوسرے معنی نہیں لیے جاسکتے۔ اسلام کی مثال لیجیے۔ اس میں ایک لفظ ہے 'صلاۃ' اب لفظ 'صلاۃ' اگرچہ ایک عربی لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی 'دعا کرنے' کے ہیں لیکن قرآن نے اسے ایک خاص مفہوم میں استعمال کیا ہے یعنی نماز ادا کرنا یعنی اللہ کے حضور نماز ادا کرنے کا ایک خاص طریقہ جس میں قیام ہے، رکوع ہے، سجود ہے، قعدہ ہے اور ان سب حالتوں میں کچھ خاص الفاظ ادا کرنے ہیں، کچھ مخصوص دعائیں مانگنی ہیں۔ اب جب بھی اسلام میں 'صلاۃ' کا لفظ استعمال کیا جائے گا اس کا مطلب ہوگا ایک مخصوص طریقے سے عبادت کرنا اور دعا کرنا۔

اسی طرح ماڈرنٹی (Modernity) جس کا ترجمہ اردو میں 'جدیدیت' سے کیا جاتا ہے،

انگریزی زبان کی عام Phrase نہیں ہے۔اس سے مراد جدید یا جدت یعنی ہر نئی چیز، ہر نئی بات، ہر نیا نظریہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ مخصوص جدید نظریہ، وہ مخصوص فکری تحریک اور وہ مخصوص طرز زندگی ہے جو قرون مظلمہ سے نکلنے کے بعد تحریک نشأۃ ثانیہ (Renaissance)، تحریک اصلاحِ مذہب (Reformation) تحریک رومانویت (Romanticism) اور تحریک تنویر/تحریک روشن خیالی (Enlightenment) کے بعد اور ان کے نتیجے میں ظاہر ہوا اور ایک ڈیڑھ صدی تک اپنی چھب دکھانے کے بعد اب پچھلی تقریباً نصف صدی سے مغرب 'پس جدیدیت' (Post-Modermity) کے عہد میں جی رہا ہے۔ پس تحریکِ جدیدیت کے عہد اور افکار کو ماڈرنٹی (Modernity) کہا جاتا ہے۔اس سے واضح ہو گیا کہ جدیدیت مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کی ایک مخصوص اصطلاح ہے اور اس کے لفظی معنی تلاش کرنا اور انہیں اسلام سے جوڑنا حماقت ہے جس سے اہل علم و دانش خصوصاً اسلامی سکالرز کو احتراز کرنا چاہیے۔

مغرب میں 'جدیدیت' (Modernity) کے نام سے جو فکری تحریک یا نظامِ فکر و عمل پایا جاتا ہے اسے جب اسلامی تناظر میں دیکھیں تو وہ اسے جدید یا جدت سے متعلق کرنے کی بجائے اسے 'جاہلیت' سے تعبیر کرتا ہے لہٰذا آگے کی بحث کے تین حصے ہوں گے:

۱۔ مغرب کی 'جدیدیت' کیا ہے؟

۲۔ مغرب کی جدیدیت اسلام میں جاہلیت کے مترادف کیوں ہے؟

۳۔ اسلام میں جدید امور، جدید نظریات اور جدت کا کیا تصور ہے؟

وبیداللہ التوفیق

مغرب کی جدیدیت کیا ہے؟

ماڈرنٹی یا 'جدیدیت' مغرب کی ایک فکری تحریک ہے جو مغرب کی فکری تحریکوں تحریک نشأۃ ثانیہ، تحریکِ اصلاحِ مذہب، تحریک رومانویت اور تحریک تنویر یا تحریک روشن خیالی کے بعد وجود میں آئی اور جو ان سب تحریکوں کے افکار و اثرات کی جامع تھی۔مغربی تہذیب

انیسویں اور بیسویں صدی میں جدیدیت کی وجہ سے عروج کو پہنچی۔ جدیدیت کے اہم افکار اور تہذیبی مظاہر درج ذیل ہیں:

۱۔ ہیومنزم: ہیومنزم (انسان پرستی) کی فکر تحریکِ نشأۃ ثانیہ میں پروان چڑھی۔ یورپ نے چرچ کی چیرہ دستوں کے ردّعمل میں یونانی اور رومن فکر و تہذیب کی طرف مراجعت کی اور خدا و مذہب کی بجائے اور اس کے مقابلے میں انسان کی مرکزیت، الوہیت اور بالادستی کو اپنالیا۔

۲۔ سیکولرزم: ہیومنزم کی بالادستی کے ردّعمل میں مسیحیت نے اپنی بقاء کے لیے ’سیکولرزم‘ کو اپنالیا تا کہ وہ کم از کم افراد کی ذاتی زندگی میں باقی رہ سکے گو اجتماعی زندگی کا خدا اور مذہب سے کچھ علاقہ نہ ہو بلکہ وہاں فکرِ انسانی کا غلبہ ہو۔

۳۔ لبرلزم: جب انسان مختار مطلق ٹھہرا اور وہ اپنا خدا خود ہے تو وہ آزاد ہے کہ جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے۔ مذہب اس کے کسی طرزِ عمل میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

۴۔ کیپٹل ازم: دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے۔ دنیا اور مال و دولت، آسائشیں، تعیّشات اور لذت پرستی ہی مقصدِ حیات ہے۔

۵۔ ایمپیریسزم (Empiricism): علم کا منبع عقل اور انسانی تجربہ و مشاہدہ ہے۔ خدا، مذہب، وحی کی تعلیمات توہمات ہیں، علم نہیں ہیں کیونکہ انسانی عقل اور تجربہ و مشاہدہ سے ان کی تصدیق (Verification) نہیں ہوسکتی۔

ورلڈ ویو: مغربی تہذیب کا ورلڈ ویو، مندرجہ بالا نظریات کی رو سے، یہ ہے:

تصورِ الٰہ: کوئی الٰہ نہیں جس کی پرستش و اطاعت انسان پر فرض ہو۔ انسان اور کائنات فطری حقائق اور حیاتیاتی عوامل (Biological Factors) کی پیداوار ہیں۔

تصورِ انسان: انسان خود مختار ہے۔ اپنی مرضی کا آپ مالک ہے، زندگی وہ جیسے چاہے گزارے۔ نہ کوئی خدا ہے اور نہ وہ کسی کا عبد ہے۔

تصورِ کائنات: دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے، آخرت کس نے دیکھی ہے؟

تصورِ علم: علم حقیقی وہ ہے جو انسانی عقل اور تجربہ ومشاہدہ کی پیداوار ہو۔ خدا، مذہب، وحی علم کا منبع نہیں کیونکہ عقل اور تجربہ ومشاہدہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوسکتی۔

جدیدیت کی اقدار

آزادی: انسان آزاد اور خود مختار ہے۔ اس کی آزادی لامحدود ہے، اس پر کوئی پابندی نہیں لگاسکتا اِلاّ یہ کہ انسان خود اپنی عقل سے، اپنی بہتری کے لیے کچھ اصول اور پابندیاں قبول کرلے۔

ترقی: ترقی سے مراد ہے دنیاوی اور مادی ترقی۔ آسائشوں، سہولتوں، تعیّشات اور لذت پرستی کا زیادہ سے زیادہ حصول، حبّ دنیا، وحبّ مال اور حبّ جاہ۔

رواداری: اپنے آپ سے غرض رکھنا۔ دوسروں کے عقائد واعمال سے صَرفِ نظر کرنا خواہ آپ کے نزدیک وہ غلط، مضر اور گمراہی پر مبنی ہی کیوں نہ ہوں۔

ریشنلٹی/عقل پرستی: ہر بات میں عقلی استدلال اور دلیل طلبی۔ مذہب اور روحانیت کی نفی۔

بنیادی انسانی حقوق: وہ انسانی حقوق جو انسان نے خود اپنے لیے طے کیے ہیں۔ مذہب اور خدا کے طے کردہ حقوق کی نفی۔

جمہوریت: انسان اپنی مرضی کا آپ مالک ہے لہٰذا حاکمیت عوام کی ہے۔ پارلیمنٹ کی لامحدود بالادستی کیونکہ وہاں خود مختار افراد/عوام کے نمائندے بیٹھتے ہیں جو مختار مطلق ہوتے ہیں لہٰذا وہ حلال وحرام کا تعین خود کرتے ہیں اور جو قانون چاہے بناسکتے ہیں۔ آئین کا تقدس کیونکہ وہ مختارِ مطلق عوام یا ان کے نمائندوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ ریاست کے تمام افراد اور اداروں پر خدا اور مذہب کی بجائے آئین کی اطاعت فرض ہے۔

قارئین کرام! ہم نے سطور بالا میں مغرب کی جدیدیت کے افکار واعمال کا جو خلاصہ پیش کیا ہے، اس سے واضح ہے کہ جدیدیت سو فیصد خلافِ اسلام ہے اور اس کے اسلامی ہونے یعنی مطابق اسلام ہونے کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام میں جاہلیت کا تصور

مسلمانوں کے دینی مآخذ، قرآن وسنت، یہ بتاتے ہیں کہ زندگی کے بارے میں صحیح اور حتمی 'علم' صرف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دیا ہے۔ اس 'حتمی طور پر صحیح علم' کا انکار کرکے یا اسے ردّ کرکے انسان اگر زندگی گزارنے کے لیے اپنی عقل، حِسّی معلومات، خواہشاتِ نفس یا محض اپنے تجربہ ومشاہدہ کو بنیاد بنا کر کوئی نظریۂ حیات وضع کرکے اس پر عمل شروع کردے تو چونکہ وہ غیر صحیح اور مخدوش 'علم' پر مبنی ہوگا لہٰذا اسے 'علم' کی بجائے 'جہالت' کہا جائے گا اور 'جہالت' پر مبنی رویے یا طرزِ عمل کو 'جاہلیت' سے تعبیر کیا جائے گا۔

'علم' اور 'جاہلیت' پر مبنی یہ رویے کوئی نیا فنامنا (Phenomenon) نہیں ہیں بلکہ جب سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا ہے، افراد، قومیں، تہذیبیں، معاشرے اور ریاستیں لامحالہ ان دونوں رویوں میں سے کسی ایک کو اپناتی رہی ہیں اس لیے کہ ان کے پاس ان دو کے علاوہ تیسرا کوئی آپشن موجود ہی نہیں ہے [۱] یہ الگ بات ہے کہ 'جاہلیت' کے حامل اس رویے کے حامل افراد اور قومیں/ تہذیبیں اپنے رویے کو غلط نہیں سمجھتیں بلکہ اسے صحیح اور علمی رویہ باور کرتی اور دوسروں کو باور کراتی ہیں اور اس کے لیے دلائل دیتی ہیں بلکہ صرف اسے ہی 'الخیر' اور 'الحق' (The Absolute Truth) قرار دیتی ہیں اور 'اسلام' اور 'علم' والے رویے کو غلط، توہمات پر مبنی، غیر علمی اور قدامت پسندی قرار دیتی ہیں اور خود کو 'جدید' (ماڈرن) اور اپنے رویے کو 'جدیدیت' (Modernity) سے تعبیر کرتی ہیں۔

ہم اس مقالہ میں جو کہنا چاہتے تھے، اس کا خلاصہ (یا Abstract) سطور بالا میں آ گیا ہے اب ہم اس کی کچھ تفصیل عرض کرتے ہیں:

---

[۱] بظاہر ایک تیسرا آپشن بھی ہے اور وہ یہ کہ لوگ 'علم' اور 'اسلام' والی آپشن کو ردّ تو نہیں کرتے لیکن اسے اللہ کے 'علم' پر چھوڑنے کی بجائے اپنی عقل اور اپنی خواہشاتِ نفس کے تابع کر لیتے ہیں۔ یوں یہ بھی 'جاہلیت' ہی کی ایک شکل بن جاتی ہے۔ اللہ کے علم ہدایت کے انکار کو آپ 'خالص جاہلیت' کہہ سکتے ہیں اور زیر بحث جاہلیت کو 'مشکّل جاہلیت'، 'تبعی جاہلیت' یا محض 'جاہلیت' کہہ سکتے ہیں لیکن ہے بہر حال یہ بھی 'جاہلیت' ہی جسے ہم ہندومت، بدھ مت، عیسائیت اور یہودیت وغیرہ کے ناموں سے جانتے اور پکارتے ہیں۔

اسلام میں 'علم' کا تصور

جب سے انسان اس دنیا میں آیا ہے یا جب بھی انسان رشد اور شعور کی آنکھ کھولتا ہے تو اس کے سامنے کچھ سوال آ کھڑے ہوتے ہیں کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اس کا مقصدِ زندگی کیا ہے؟ اسے زندگی کیسے گزارنی چاہیے؟ دوسرے انسانوں، دوسری مخلوقات اور کائنات کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب سوچنے اور دینے پر ہر انسان مجبور ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ دنیا میں کوئی رویہ اختیار نہیں کرسکتا، زندگی گزارنے کے لیے کوئی لائحہ عمل نہیں بنا سکتا۔ اور انسانی فکر کی معلوم تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان نے اصولاً اس کے دو جواب دیے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ یہ تسلیم کرے کہ اسے ایک خالق نے پیدا کیا ہے اور وہی اسے ان سوالوں کے جواب دے سکتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ وہ ایک عاقل و بالغ اور خود مختار ہستی ہے جو اپنے بارے میں سارے فیصلے خود کرسکتی ہے لہٰذا اسے کسی 'ہادی' کی رہنمائی کی ضرورت نہیں لہٰذا وہ دنیا کی زندگی اپنی مرضی، اپنی خواہشات اور اپنی عقل کے مطابق گزار سکتی ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ ان دونوں آپشنز میں سے کون سی درست اور انسان کے لیے مفید ہے، ہمیں دونوں جوابات کی کچھ تفصیل معلوم ہونی چاہیے۔

پہلا جواب

پہلے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ انسانوں میں سے ہمیشہ ہی بعض سچے، کھرے اور بہترین کردار کے انسان یہ کہتے آئے ہیں کہ:

* انسان اور اس کائنات (زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے) کا خالق، مالک، مدبر، رازق، ربّ، مطاع، معبود اور ہادی صرف ایک اللہ ہے۔ جس طرح ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ایک مینوفیکچرر (Manufacturer) جب کوئی مشین بناتا ہے تو وہ گاہکوں کو مشین بیچتے وقت ساتھ ایک کِٹ یا لٹریچر دیتا ہے جس میں اس مشین کے بارے میں اور اس کے صحیح طریق استعمال کے بارے میں ہدایات درج ہوتی ہیں تاکہ مشین خراب نہ ہو بلکہ جس مقصد

کے لیے بنائی گئی ہے وہ مقصد پورا کرتی رہے۔

* اللہ تعالیٰ نے بحیثیت خالق جب انسان کو پیدا کیا تو ساتھ جولٹریچر دیا اس کے دو حصے تھے۔ایک میں یہ بتایا کہ یہ مشین ہے کیا؟اس کے اہم پرزے کون کون سے ہیں یعنی دنیا کی زندگی کے بارے میں بنیادی علم۔اسے اللہ تعالیٰ نے ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا﴾ [البقرہ۲:۳۱] قرار دیا چنانچہ ہر انسان جو اس دنیا میں آتا ہے دنیا کے بارے میں بنیادی معلومات والدین سے اور انسانی معاشرے سے حاصل کرلیتا ہے۔اس لٹریچر یا علم کا دوسرا حصہ وہ تھا جسے صانع (مینوفیکچرر) نے 'علمِ ہدایت' کہا یعنی اس مشین کے صحیح استعمال اور صحیح کارکردگی کے بارے میں ہدایات کہ اسے کیسے استعمال کیا جائے تاکہ جس مقصد کے لیے یہ مشین بنائی گئی ہے، یہ اسے پورا کرتی رہے۔اسے اللہ نے 'علم ہدایت' کہا ہے۔فرمایا ﴿قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِيۡعًا ۚ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۳۹﴾﴾ [البقرہ۲:۳۸،۳۹] قرآن کی پہلی سورت الفاتحہ جسے قرآن کا پیش لفظ یا مقدمہ سمجھنا چاہیے اور یہ اتنی اہم ہے کہ اسے ہر نماز میں نہیں ہر رکعت میں پڑھنا ضروری اور واجب ہے، اس میں ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی ہے کہ اللہ سے ہدایت مانگو ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ﴿۵﴾﴾ [الفاتحہ۱:۵] اور دوسری سورت البقرہ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے گویا اپنے بندوں کی درخواست قبول کرتے ہوئے فرمایا ﴿ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ ۛۚ فِيۡهِ ۛۚ هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۲﴾﴾ [البقرہ۲:۲] یعنی تم نے ہدایت کی دعا مانگی تھی تو یہ لو ہم نے تمہاری ہدایت کا انتظام کردیا ہے اور تمہارے لیے ہدایت پر مبنی پوری کتاب نازل فرمادی ہے۔

* اس 'علم ہدایت' کی بعض خصوصی صفات خود اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں مثلاً:

- اس علم کا منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے:

﴿قَالَ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ اللّٰهِ ۖ﴾ [الاحقاف۴۶:۲۳]

﴿اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۳۱﴾﴾ [البقرہ۲:۲۳۱]

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۱۵﴾﴾ [البقرہ۲:۱۱۵]

- یہ علم ہدایت حتمی طور پر صحیح ہے ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾[البقرہ۲: ۲]اس میں شک ،تشکیک (Skepticism)اور غلطی کا کوئی امکان نہیں۔

- یہ نہایت جامع ہے اور شمول وکمال کا حامل ہے، اس میں کوئی کمی اور نقص نہیں ہے۔ اس میں ہر چیز کا بیان ہے۔﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾[الانعام۶:۳۸]

* ہدایت کا یہ علم ہے کیا؟ یعنی اس کا content کیا ہے؟ اس میں کیا کہا گیا ہے؟ یہ جاننا بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے بعد ہی ہم جان سکیں گے کہ جو اس علمِ ہدایت سے متناقص ہو، وہ علم نہیں جہالت اور جاہلیت ہے۔ اس کے بارے میں قرآن وسنت سے جو رہنمائی ملتی ہے، اس کی رو سے علم ہدایت کے اہم نکات یہ ہیں:

- قرآن کہتا ہے کہ انسان اللہ کا عبد ہے۔ لیکن انسان کا خالق ، مالک ،معبود، رازق، ربّ ، ہادی ہونے کے باوجود اللہ انسان پر اس عبودیت کو مسلط نہیں کرتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے عبودیت کا یہ رویہ اختیار کرے، اگر چہ اس نے انسان کو پیدا کرتے وقت یہ بات اس کی Gene میں رکھ دی تھی (جس کا مظہر ہے ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ ﴾ [الاعراف ۷: ۱۷۲]اور انسان کو بالطبع عبد رکھنے کی بجائے اس میں خیر وشر دونوں کے رجحانات رکھ دیے تھے ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا﴾[الشّمس۹۱: ۸] لیکن انفس وآفاق کے بے شمار عقلی دلائل سے اسے سمجھایا کہ اس کے لیے عقلی ،فطری ،صحیح اور سائنٹفک رویہ یہی ہے کہ وہ اللہ کے علم ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ کی عبودیت کا رویہ اختیار کرے۔ اللہ کی عبودیت کا یہ رویہ 'اسلام' کہلاتا ہے۔ عربی کے لفظ ''اسلام'' کا مطلب ہے فرماں برداری کرنا، بلاشروط وحدود سرِ تسلیم خم کرنا، متبع اور مطیع ہوجانا اور جو انسان یہ رویہ اختیار کرے اسے عربی میں کہتے ہیں ''مسلم''، یعنی اللہ کا مطیع اور فرمانبردار ہوجانے والا، اس کی بندگی و پرستش کرنے والا۔

- قرآن ہمیں اس علم ہدایت کی یہ خاصیت بھی بتاتا ہے کہ اس کی رو سے دنیا کی یہ زندگی عارضی اور فانی ہے اور محدود مدت کی ہے (آج کل دنیا میں انسان کی اوسط عمر ۶۰، ۷۰ سال ہے)۔ ہر انسان کو کچھ عرصہ بعد مر جانا ہے۔ اور کائنات کا یہ پورا نظام (زمین، آسمان اور

وہ سب کچھ جو ان کے درمیان ہے) ایک خاص مدت کے بعد (جسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے) ختم کر دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ ایک نیا جہان تخلیق کریں گے (جسے موجودہ نظامِ حیات کے بعد آنے کی وجہ سے 'آخرت' یا آخر میں آنے والا (Hereafter) کہا جاتا ہے۔

- دنیا کا موجودہ نظام درحقیقت ایک امتحان اور آزمائش ہے جس کا نتیجہ اگلے جہان میں نکلے گا۔ انسان کا امتحان اس امر میں ہے کہ وہ دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزارتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ گزارے گا تو آخرت کے امتحان میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہاں اللہ کی خوشنودی سے اور اس کی نعمتوں سے متمتع ہوگا اور وہ نظام ہمیشہ کے لیے ہوگا، عارضی اور فانی نہ ہوگا۔ اور اگر وہ دنیا میں اللہ کی ہدایت کو ردّ کر دینے کا فیصلہ کرے گا اور زندگی اپنی مرضی، اپنی عقل، اپنی خواہشات کے مطابق گزارے گا تو آخرت میں اللہ کی ناراضی اور سزا و عذاب کا مستحق ٹھہرے گا۔

- دنیا چونکہ دارالعمل ہے، دارالجزاء نہیں ہے لہٰذا یہاں زندگی گزارنے کے اسباب اللہ ہر انسان کو دیتا ہے خواہ وہ اس کی ہدایت کو قبول کر کے عبودیت کا رویہ اپنائے یا اس کی ہدایت کو ردّ کر کے اپنی مرضی کی زندگی گزارے یعنی خواہ مسلم ہو یا کافر۔ اگر کوئی شخص عبودیت کے رویے کو چنے گا تو اللہ کی طرف سے نیکی کے راستے کھلتے جائیں گے اور اگر کوئی جاہلیت کا رویہ اختیار کرے گا تو اس کے لیے کفر کے راستے کھلتے چلے جائیں گے۔

تاہم یہاں فرد اور قوموں کے بارے میں اللہ کی سنت الگ الگ ہے۔ اگر فرد اللہ کی ہدایت کے راستے پر چلے لیکن معاشرہ اس روش پر نہ چل رہا ہو تو ظاہر ہے دنیاوی لحاظ سے یہ آدمی مشکلات اور شدائد کا شکار ہوگا لیکن آخرت میں وہ (ان شاء اللہ) کامیاب ہوگا، اگرچہ دلی خوشی، سعادت اور اطمینانِ قلب کی نعمت اسے دنیا میں بھی ملے گی ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ﴾ [الرعد ۱۳: ۲۸] لیکن اگر سارا معاشرہ/قوم/تہذیب ہدایت کے راستے پر چل رہی ہو تو وہ دنیا میں بھی کامیاب و کامران ہوگی۔ اس کے برعکس اگر ساری قوم ہدایت کے راستے کو چھوڑ کر جاہلیت کی راہ پر چل رہی ہو تو وہ دنیا میں بھی (بالآخر) ناکام ہوگی اور آخرت میں بھی۔ تاہم اگر کوئی راہ ہدایت پر قائم اور عامل قوم موجود نہ ہو اور کافرانہ نظامِ دنیا

سنبھالنے میں ان سے بہتر صلاحیت کے حامل ہوں تو ظاہر ہے دنیا کی امامت کفار کے حصے میں آئے گی نہ کہ ان نام نہاد 'مسلمانوں' کے جو صرف ہدایت کا نام لیتے ہوں اور اس پر عامل نہ ہوں۔

- علمِ ہدایت اور اس پر چلنے والوں کے بارے میں اصولی بات ہم نے واضح کر دی۔ جہاں تک علمِ ہدایت کی تفصیلات کا تعلق ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں پر عمل کے حوالے سے اس کی تعلیمات کیا ہیں تو یہ ایک تفصیلی موضوع ہے جس کی وضاحت کا یہ موزوں محل نہیں۔ البتہ قرآن وسنت نے جن اعمال و مظاہر کو جاہلیت قرار دیا ہے، ظاہر ہے وہ ہدایت الٰہی کی نقیض ہیں اور دنیا وآخرت میں سببِ خسران۔

اسلام اور جاہلیت

اسلام اور علمِ ہدایت پر گفتگو کے بعد آیئے اب دیکھیں کہ قرآن وسنت کن امور کو 'جاہلیت' قرار دیتے ہیں:

- جہالت جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے، اصلاً ضد ہے علم کی اور جاہلیت وہ انسانی رویہ اور طرزِ عمل ہے جو جہالت پر مبنی ہو۔ گویا ہر وہ عمل، ہر وہ رویہ جاہلیت پر مبنی سمجھا جائے گا جو اللہ کے علمِ ہدایت کا نقیض ہو، اس کے خلاف ہو، اس سے متضاد ہو یا جسے اللہ کی کتاب یا اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مبنی بر جاہلیت قرار دیا ہو۔

- یہ بھی یاد رہے کہ جس طرح 'اسلام' (یعنی اللہ کی فرمانبرداری کا رویہ) کی نسبت کسی خاص زمان ومکان یا شخصیت سے نہیں بلکہ سارے انبیاء ورسل جس علم ہدایت کو لے کر آتے تھے وہ 'اسلام' ہی تھا خواہ وہ ہزاروں سال قبل کے حضرت آدمؑ و نوحؑ ہوں یا ساڑھے چودہ سو سال پہلے کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اس پر عمل پیرا سارے لوگ 'مسلم' تھے خواہ ان کا تعلق کسی بھی زمان ومکان سے ہو۔ اسی طرح جاہلیت (یعنی انکارِ علمِ ہدایت) کا تعلق بھی کسی خاص زمان ومکان یا کسی خاص شخصیت سے نہیں ہے بلکہ جاہلیت بھی ازل سے جاری وساری ہے۔ اس کا بنیادی مقدمہ ہر جگہ، ہمیشہ ایک ہی رہا ہے یعنی اللہ کے علمِ ہدایت کا انکار اور زندگی

اپنی مرضی، اپنی عقل اور اپنی خواہشات کے مطابق بسر کرنا۔ ہاں! اس کے نمایاں مظاہر بعض جگہ ایک دوسرے سے کچھ مختلف ہو سکتے ہیں مثلاً ایک قوم تجارت میں کم تولنے کی وجہ سے معروف تھی، کوئی قوم جنسی بے راہروی میں زیادہ مبتلا تھی، کوئی قوم بتوں کی پوجا کرتی تھی، کوئی سورج اور آگ کی، کوئی اولاد کو قتل کر دیتی تھی، کوئی فحاشی وعریانی میں مبتلا تھی وغیرہ وغیرہ۔قرآن حکیم نے حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے کے دور کو، جس میں لوگ وحی الٰہی کی بجائے اپنی مرضی کی زندگی بسر کرتے تھے، اسے "الجاهلية الاولىٰ" کہا۔اسی طرح آج مغرب کی کفریہ تہذیب بھی سرتاپا جاہلیت پر مبنی ہے کیونکہ یہ اللہ کے علمِ ہدایت کو ردّ کرتی ہے اور یہاں انسان زندگی اپنی مرضی، اپنی عقل، اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق گزارتے ہیں یہ کوئی جدید جاہلیت بھی نہیں وہی پرانی جاہلیت ہے۔بقول اقبال ؎

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

ہاں زمانی لحاظ سے اسے جاہلیتِ جدیدہ یا اکیسویں صدی کی جاہلیت قرار دیا جاسکتا ہے۔[۱]

قرآن حکیم کی رو سے جاہلیت کے رویے

جاہلیت کا لفظ قرآن حکیم میں چار دفعہ استعمال ہوا ہے:

۔ سورۃ آل عمران میں غزوۂ احد پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ﴾[آل عمران ۳: ۱۵۴] یعنی منافقین اللہ کی راہ میں لڑنے سے کتراتے رہتے تھے اور جہالت پر مبنی یہ گمان کررہے تھے کہ اللہ مسلمانوں کی نصرت نہیں فرمائے گا اور انہیں مکمل شکست اور بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا۔یعنی اللہ کے بارے میں غلط گمان رکھنا، حسن ظن نہ رکھنا۔

۔ سورۃ المائدہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے محمد قطب کی 'الجاهلية فى القرن العشرين' اور مولانا مودودی کی 'اسلام اور جاہلیت'۔

تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنُوۡكَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ‌ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّصِيۡبَهُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِهِمۡ‌ؕ وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ ﴿49﴾ اَفَحُكۡمَ الۡجَاهِلِيَّةِ يَبۡغُوۡنَ‌ؕ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكۡمًا لِّقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ﴿50﴾﴾ [المائدۃ ۵:۴۹،۵۰] یہاں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی اس روش کو جاہلیت قرار دیا ہے کہ وہ اللہ کے فیصلے پر راضی اور قانع رہنے کی بجائے اپنی خواہشاتِ نفس پر مبنی فیصلے کے خواہاں تھے۔

- سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَقَرۡنَ فِىۡ بُيُوۡتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاهِلِيَّةِ الۡاُوۡلٰى﴾ [الاحزاب ۳۳:۳۳]

یہاں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے تبرج کو یعنی عورتوں کے بن ٹھن کر باہر جانے، چست اور باریک لباس پہننے، اپنی زیب و زینت ظاہر کرنے اور بالواسطہ طور پر مردوں کو گناہ کی ترغیب دینے کو جاہلیت سے تعبیر کیا ہے۔

- سورۃ الفتح میں فرمایا ﴿اِذۡ جَعَلَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الۡجَاهِلِيَّةِ﴾ [الفتح ۴۸:۲۶]

یعنی جب کافروں نے اپنے دلوں میں حمیت اور عصبیت اور وہ بھی جاہلی حمیت کا جذبہ پیدا کیا۔ حَمِيَّةَ الۡجَاهِلِيَّةِ سے مراد جاہلی عربوں کا تعصب تھا جو وہ اپنے خداؤں کی نسبت رکھتے تھے اور اس تعصب کی بناء پر وہ ان کے سوا کسی کی پرستش سے پرہیز کرتے تھے۔

اس کے علاوہ بھی قرآن حکیم نے جاہلی عربوں کے بعض عقائد و نظریات اور رسوم و آداب کی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً:

شرک، والدین کی نافرمانی، قتلِ اولاد، فحاشی اور قتل و غارت:

﴿قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمۡ عَلَيۡكُمۡ‌ اَلَّا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـئًا وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا‌ ۚ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ مِّنۡ اِمۡلَاقٍ‌ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَاِيَّاهُمۡ‌ ۚ وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ‌ ۚ وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِىۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا

بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿151﴾ [الانعام۶:۱۵۱]

زنا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِیْلًا ﴿32﴾ [الاسراء۱۷:۳۲]

کنیزوں کو زنا پر مجبور کرنا: ﴿وَلَا تُکْرِهُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَمَنْ یُّکْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِکْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿33﴾ [النور۲۴:۳۳]

بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا: ﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ﴿8﴾ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴿9﴾﴾ [التکویر۸۱:۸،۹]

شراب نوشی وجُوا: ﴿یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ؕ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ﴾ [البقرہ۲:۲۱۹]

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿90﴾ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ﴾ [المائدۃ۵:۹۰،۹۱]

سُود لینا: ﴿اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ﴾ [البقرہ۲:۲۷۵،۲۷۶]

جانوروں کے ذبیحے میں من مانی کرنا: ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِیْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰکِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْکَذِبَ ؕ وَاَکْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿103﴾﴾ [المائدۃ۵:۱۰۳]

* اللہ کی نعمتوں کی نسبت غیر اللہ کی طرف کرنا، اللہ کے فضل کا انکار کرنا اور اس کا شکر ادا نہ کرنا جاہلوں کا طریقہ ہے ﴿یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ یُنْکِرُوْنَهَا وَاَکْثَرُهُمُ الْکٰفِرُوْنَ ﴿83﴾﴾ [النحل۱۶:۸۳]

* حوادث کی نسبت اللہ سے کرنے کی بجائے زمانے سے کرنا اور اسے برا بھلا کہنا جیسا

کہ قرآن حکیم میں ہے کہ کفار کہتے تھے کہ ﴿وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾ [الجاثیہ ۴۵:۲۴]

* اللہ کی طے کردہ تقدیر کو تسلیم نہ کرنا اور اپنے برے کاموں کی نسبت اللہ کی طرف کرنا جیسا کہ قرآن حکیم نے مشرکوں کو طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ وہ کہتے تھے ﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا﴾ [الانعام ۶:۱۴۸]

* آخرت کا انکار کرنا جیسا کہ کفار و مشرکین کہتے تھے ﴿وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝۲۹﴾ [الانعام ۶:۲۹]

* اللہ کی آیات اور وحی کا انکار کرنا جیسا کہ قرآن حکیم نے جاہلوں کا موقف بتاتے ہوئے فرمایا کہ وہ کہتے تھے ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۲۵﴾ [الانعام ۶:۲۵]

* حلال وحرام کا اختیار غیر اللہ کو دینا ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [التوبہ ۹:۳۱]

* نا اُمید ہو جانا۔ مومن کبھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا لیکن کافر مایوس ہو جاتا ہے کیونکہ اسے اللہ پر یقین نہیں ہوتا۔ ﴿اِنَّهٗ لَا يَايْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸۷﴾ [یوسف ۱۲:۸۷]

* حق کی بجائے اپنے آباء اجداد کی پیروی کرنا ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ﴾ [لقمان ۳۱:۲۱]

* کثرت کو مدار حق سمجھنا جبکہ قرآن کہتا ہے ﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ﴾ [الانعام ۶:۱۱۶]

* غلو اور افراط وتفریط سے کام لینا جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح کو خدا بنا لیا تھا ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ﴾ [التوبہ ۹:۳۰]

* اعمال کے بغیر نجات کی توقع رکھنا جیسا کہ ان کے بارے میں قرآن نے بتایا کہ وہ کہتے ہیں ﴿نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ ۭ﴾ [المائدۃ ۵:۱۸]

* لڑکیوں کی پیدائش کو برا سمجھنا۔ ﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ﴾ [النحل ۱۶: ۵۸]

جاہلیت حدیث کی رو سے

۔ کاہنوں، جادوگروں اور نجومیوں کے پاس جانا اور ان سے غیب کی باتیں اور قسمت کا حال معلوم کرنا۔

"قال معاوية بن الحكم يارسول اللهﷺ: امورًا كنا نصنعها فی الجاهلية كنا ناتی الكهّان، قال: فلا تاتوا الكهان۔"[۱]

۔ قبور کو سجدہ گاہ بنانا اور مُردوں سے اعانت طلب کرنا جس کی مذمت کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "لعن الله اليهود والنصارىٰ إتخذوا قبور أنبيائهم مساجد۔"[۲]

۔ جنّوں، عاملوں اور جادوگروں سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنی دعاؤں اور تعویزوں سے انہیں بُرے انجام اور تکلیفوں، مصیبتوں سے بچالیں گے جیسا کہ قرآن حکیم نے ان کے بارے میں بتایا ہے کہ ﴿وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا﴾ [الجن ۷۲: ۶]

جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ استعاذہ صرف اللہ تعالیٰ سے کرنا چاہیے اور مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ یہ کہا کریں "أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِن شَرِّ مَا خَلَقَ، لَمْ يَضُرَّهُ شَيْءٌ حَتَّى يَرْتَحِلَ مِن مَنْزِلِهِ ذلكَ."[۳]

۔ شگون لینا کیونکہ یہ اللہ پر یقین کے منافی ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "لاَ

---

[۱] رواہ مسلم
[۲] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۱۳۹۰، صحیح مسلم، رقم الحدیث ۵۲۹
[۳] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۷۰۸

عَدْوَی وَلاَ طِیَرَۃَ وَلاَ ھَامَۃَ وَلاَ صَفَرَ۔"[١]

۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: چار چیزیں جاہلیت کی عادات میں سے ہیں: ١۔اپنے حسب نسب پر فخر کرنا ٢۔دوسروں کو ان کے نسب پر طعنہ دینا ٣۔ستاروں سے بارش طلب کرنا ۴۔میت پر نوحہ کرنا۔

۔ قبائلی عصبیت اور تحزب۔ جب ایک انصاری اور مہاجر میں جھگڑا ہو گیا اور انصاری نے انصار کو پکارا اور مہاجر نے مہاجرین کو پکارا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "مَا بَالُ دَعْوَی الْجَاھِلِیَّۃِ۔"[٢]

۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو کھانے پینے اور پہننے میں فخر ومباہات سے منع کیا۔فرمایا کہ سونے چاندی کے برتنوں میں نہ کھاؤ، ریشم نہ پہنو اور عورتوں کی طرح کے شوخ رنگوں کے سرخ پیلے رنگ کے کپڑے نہ پہنو اور فرمایا: "إن ھذہ من ثیاب الکفار فلا تلبسھا۔"[٣]

۔ عصبیت اور گمراہی کی خاطر جان دینا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ومن قاتل تحت رایۃٍ عَمِیَّۃٍ، یغضبُ لعَصَبِیۃٍ، أو یَدْعُو إلی عَصَبِیَّۃٍ، أو ینصرُ عَصَبِیَّۃً، فقُتِلَ، فقَتْلُہ جاھلیۃٌ۔"[۴]

۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ کے نزدیک بدترین آدمی وہ ہے جو اسلام میں جاہلیت کو داخل کرے: "أبغضُ الناس إلی اللہِ ملحدٌ فی الحرمِ، ومبتغٍ فی الإسلامِ سنۃَ الجاھلیۃِ۔"[۵]

خلاصہ یہ کہ ہر وہ خیال، نظریہ، عقیدہ، علم، فکر اور ہر وہ عمل جہالت اور جاہلیت ہے جو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے 'علم ہدایت' کے خلاف ہو بالفاظِ دیگر جو فکر وعمل بھی خلافِ اسلام ہو وہ

---

[١] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۵٧٩۴
[٢] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۴٩٠۵
[٣] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۵۴٣۴
[۴] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ١٨۴٨
[۵] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ٦٨٨٢

جہالت اور جاہلیت ہے۔ وہ صحیح معنوں میں نہ علم ہے، نہ تہذیب ہے، نہ وہ مطابق عقل وفطرت ہے اور ہر وہ انسان جو اس 'علم ہدایت' کو ردّ کرتا ہے اور اپنی عقل اور خواہشات کے مطابق زندگی گزارتا ہے وہ درحقیقت بے عقل، بیوقوف اور کوڑھ مغز ہے[۱]۔ وہ انسان ہی نہیں حیوان ہے[۲] خواہ دنیا کی نظروں میں بہت بڑا فلسفی اور عبقری ہو۔ اس کا آخری نتیجہ دنیا میں فساد فی الارض اور آخرت میں جہنم کا عذاب ہے۔

مغرب کی بالادستی کا اشکال

یہاں کسی کے ذہن میں یہ اشکال پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ اگر علمِ ہدایت ہم مسلمانوں کے پاس ہے اور اہل مغرب کا فکر وعمل 'جاہلیت' پر مبنی ہے تو مغرب غالب اور بالادست کیوں ہے؟ اور مسلمان دنیا میں ذلیل وخوار کیوں ہو رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ دنیا میں بھی غلبہ 'علمِ ہدایت' رکھنے والوں ہی کو دیتا ہے بشرطیکہ وہ اس پر عامل ہوں۔[۳] لیکن اگر وہ اگر زبان سے علمِ ہدایت کا اقرار کریں اور اس پر عمل نہ کریں تو اللہ کا وعدہ ایسے منافقوں سے نہیں ہے۔ اور اللہ نے اس زمین کو پیدا کیا ہے تو لامحالہ اس کا نظام کسی کو تو چلانا ہے۔ اگر اللہ کے صالح بندے نہ ہوں جو اس کے دیے ہوئے علمِ ہدایت کے مطابق اس نظام کو چلائیں تو مجبوراً دنیا کے نظام کو وہی چلائیں گے جو اس نظام کو چلانے کی صلاحیت دوسروں سے زیادہ رکھتے ہوں، خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں۔

اسلام میں جدید (احداث ونوازل) کا حکم

یہ واضح ہوجانے کے بعد کہ مغرب کی 'جدیدیت' اسلام کی رو سے 'جاہلیت' ہے اور وہ مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہے بلکہ ہر سچا مسلمان اس کا مکلف ہے کہ وہ اسے ردّ کردے۔ اب اس بحث کا آخری نکتہ باقی ہے اور وہ یہ کہ اسلام میں جدید یعنی نئی چیزوں، نئے

---

[۱] قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَهَاۗءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ [البقرہ۲:۱۳]

[۲] مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ [الجمعہ ۶۲:۵]

[۳] وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ [آل عمران ۳:۱۳۹]

خیالات، نئے رویوں، نئے علوم کا کیا حکم ہے؟

اس بارے میں اصولی رہنمائی نبی کریم ﷺ نے امت کو دے دی اور فرمایا کہ:
"کل بدعة ضلالة، وكل ضلالة في النار۔"[۱]

اور اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: "من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد۔"[۲]

یعنی ہر وہ نیا فکر وعمل اسلام میں مردود ہے جس کی اصل اسلام میں نہ ہو یعنی وہ اسلامی تعلیمات، ان کے مقاصد اور ان کی روح کے خلاف ہو۔

اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ ہر وہ نیا فکر وعمل اسلام کے خلاف نہیں ہے جو اسلامی تعلیمات اور ان کے مقاصد اور ان کی روح کے خلاف نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ تمدنی امور میں اور وہ شعبہ جسے آج کل سائنس وٹیکنالوجی کہا جاتا ہے، اس میں ہر وہ پیش رفت، ہر نیا فکر وعمل جائز ہے جو اسلامی تعلیمات اور اس کے مقاصد کے مطابق ہو یا اسلامی تعلیمات اور اس کے مقاصد کے خلاف نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں تمدنی امور میں سائنسی وفنی امور میں وہ افکار واعمال مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہیں جو اسلامی تعلیمات اور ان کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔ چنانچہ مسلمانوں نے، جب وہ موجودہ زوال سے دوچار نہیں ہوئے تھے، سائنس وٹیکنالوجی میں بے بہا ترقی کی اور علماءِ اسلام نے اس کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ ہاں! انہوں نے ان افکار وخیالات اور اعمال کی ضرور مخالفت کی جو ان کی رائے میں اسلامی تعلیمات اور ان کے مقاصد کے خلاف تھے۔

امید ہے قارئین پر واضح ہوگیا ہوگا کہ ہم مسلمان مغرب کی 'جدیدیت' کو کیوں ردّ کرتے ہیں اور کیوں اسے 'جاہلیت' پر محمول کرتے ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین۔

---

[۱] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۳۱ ۲

[۲] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۲۶۹۷

تسہیل القرآن

فہمِ قرآن کے لیے (قسط ۴)

* قرآن کریم کی عربی عبارت کا مفہوم اُردو زبان میں اتنی وضاحت کے ساتھ کہ تفسیر کی ضرورت نہ پڑے
* جمہور مفسرین کی راہ سے نکلے بغیر
* زائد الفاظ نسخ میں دیے گئے ہیں

سورۃ البقرہ آیت (۲۶-۳۲)

قرآنی مثالوں پر اعتراض کرنے والے فاسق ھیں

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿26﴾

بے شک اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں شرماتے کہ وہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی مثال دیں۔ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے لیکن کفار کہتے ہیں کہ اللہ نے اس طرح کی مثال کیوں دی ہے؟ اس طرح اللہ تعالیٰ کی ان مثالوں سے بہت سے لوگ ہدایت پاتے ہیں اور بہت سے گمراہ ہو جاتے ہیں اور گمراہ ہونے والے اکثر فاسق اور نافرمان ہیں۔

فاسقوں کی علامات

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿27﴾

فاسق وہ ہیں جو:

۱۔ اللہ سے کیے پختہ عہد کو توڑتے ہیں

۲۔ جن امور کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے انہیں توڑتے ہیں۔

۳۔ اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ھیں کہ یہی لوگ خسارے میں رہنے والے ہیں۔

وجود باری تعالیٰ کے دلائل-اللہ کا خالق ھونا

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ

تم کیسے اللہ کا انکار کر سکتے ہو جبکہ:

وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿28﴾

- تم کچھ نہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں زندگی عطا کی۔ پھر وہ تمہیں موت دے گا اور پھر دوبارہ زندہ کرے گا اور تم اسی کی طرف لوٹو گے۔

هُوَالَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ

- زمین میں سب کچھ جو انسانوں کے لیے ہے اس کا خالق اللہ ہی ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ

- پھر اس نے عالم بالا کی طرف توجہ فرمائی تو سات آسمان تخلیق کیے۔

وَهُوَبِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿29﴾

- اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

تخلیقِ انسان کی تفصیل

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿30﴾

اور اس وقت کا تصور کرو جب ربّ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ (ایک صاحبِ اختیار ہستی) بنانے والا ہوں۔ تو فرشتوں نے کہا: کیا آپ ایسا انسان بنا رہے ہیں جو زمین میں فساد پھیلائے گا اور خون بہائے گا؟ جبکہ ہم آپ کی تسبیح اور تحمید و تقدیس کر ہی رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو مَیں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿31﴾

اس پر اللہ تعالیٰ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور ان سے کہا کہ ان چیزوں کے نام بتاؤ تاکہ پتا چلے کہ تمہارا اندازہ صحیح ہے یا غلط!

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿32﴾

فرشتوں نے کہا: ہر عیب سے پاک ہیں آپ۔ ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا آپ نے دیا ہے۔ بے شک ہم سے غلطی ہوئی، آپ علم بھی رکھتے ہیں اور حکمت بھی۔

تعلیم و تربیت　مولانا اشرف علی تھانویؒ

سر سید احمد خان، مولانا گنگوہیؒ اور مولانا نانوتویؒ

سر سید کا پیغام اور مولانا نانوتویؒ کا بصیرت افروز جواب

ہندوستان میں نیچریت کا بیج سر سید کا بویا ہوا ہے۔ سر سید نے جب علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی تو انہوں نے اپنے ایک صاحب سے کہا کہ تم گنگوہ جاؤ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ سے بعد سلام مسنون میری جانب سے عرض کرو کہ اس وقت مسلمانوں کی حالت دن بدن خراب تر ہوتی جارہی ہے، اس کے مقابل دوسری غیر مسلم قومیں ترقی کر رہی ہیں، مسلمانوں کی ترقی کے لیے انگریزی تعلیم کے لیے ایک کالج کی بنیاد ڈالی ہے، اس کام میں آپ بھی شرکت فرمائیں اور ہاتھ بٹائیں تو بہت جلد کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ یہ صاحب پیر جی محمد عارف صاحب تھے۔

یہ پیر جی گنگوہ حاضر ہوئے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ وہ سر سید کی طرف سے پیغام لے کر آئے ہیں، اس کے بعد وہ پیام پیش کیا، حضرت نے پیام سن کر فرمایا کہ میری تو ساری عمر قال اللہ وقال رسول اللہ میں گزری ہے، مجھے ان چیزوں کا زیادہ تجربہ نہیں۔ ہاں! مولانا محمد قاسم صاحب کو ان چیزوں میں زیادہ بصیرت حاصل ہے، اُن سے جا کر بیان کیجیے۔ وہ اگر شرکت کو قبول فرمائیں گے تو ہم سب اُن کے ساتھ ہیں۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ تشریف فرما ہوئے، مولانا کی آمد اتفاقی تھی۔ پیر جی صاحب نے سر سید کا پیام اُن کو پہنچایا۔ حضرت مولانا نے سن کر فرمایا کہ پیر جی! لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک تو وہ شخص ہوتا ہے جس کی نیت اچھی ہے مگر عقل نہیں ہوتی۔ دوسرا وہ شخص ہے جس میں عقل ہوتی ہے مگر نیت اچھی نہیں ہوتی۔ تیسرا وہ شخص ہوتا ہے کہ اُس کی نہ نیت اچھی ہوتی ہے اور نہ عقل ہوتی ہے۔ مَیں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ سر سید کی نیت اچھی نہیں، کیا خبر ہے؟ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اُن کو عقل کافی نہیں۔ اس لیے کہ وہ جس چیز کے ذریعے مسلمانوں کو معراجِ ترقی پر لے جانا چاہتے ہیں، وہی چیز تو ان کے تنزل کا سبب ہو گی اور تباہی اور بربادی کا بھی۔

پیر جی صاحب نے عرض کیا کہ جس چیز کی کمی حضرت نے سر سید میں محسوس فرمائی ہے، اسی

کمی کو پورا کرنے کے لئے تو آپ حضرات کی شرکت کی ضرورت ہے۔ مولانا نے اس کا جو جواب دیا، غیر عارف اس کا جواب دے ہی نہیں سکتا تھا۔ حضرت مولانا نے فی البدیہہ یعنی فوراً فرمایا کہ جی ہاں! یہ تو صحیح ہے، لیکن جس کام کا بانی اپنے کام کی بنیاد میں جو چیز شامل کرتا ہے، اُس کے جذبات اور نیت کے آثار اُس چیز میں پیوست ہو جاتے ہیں، وہ اُس سے جدا نہیں ہوتے اور اس شخص کے شروع کردہ کام اور اس کی بنیاد کی اصلاح نہ صرف مشکل ہے، بلکہ عادۃً محال ہے۔ اور اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک تلخ درخت بویا جائے اور ایک بزرگ کو شربت کا مٹکا دے کر عرض کیا جائے کہ وہ اس کی بنیاد میں ڈالتا رہے، مگر جب وہ درخت برگ و بار پھل و پھول لائے گا تو وہ سب تلخ ہوں گے۔ اسی طرح یہاں بھی کسی عالم اور بزرگ کو شریک کر کے، اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے، تب بھی یہ کمی پوری نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ممکن ہے کہ خود شرکت کرنے والے میں اس کے اثرات آ جائیں چنانچہ تحریکِ خلافت کے زمانے میں جب یہ لوگ علی گڑھ کالج کو بند کرنے کے ارادہ سے علی گڑھ پہنچے اور وہاں انہوں نے یہی کہا کہ مسلمانوں کو سارے نقصانات اس کالج اور اس کی تعلیمات کی بدولت پہنچے ہیں۔ اس نے ہندوستان میں انگریزیت، عیسائیت اور دہریت کو فروغ دیا ہے۔ یہ کہنے والے بڑے بڑے مسلمان لیڈر تھے جو اسی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ مَیں نے سن کر کہا کہ یہ لوگ تو پچاس برس کے تجربہ کے بعد اس بات کو سمجھے ہیں، جب کہ ہمارے ایک مبصر نے یہی بات اس کی بنیاد پڑتے وقت کہہ دی تھی کہ اس کے یہ نتائج ظاہر ہوں گے:

حافظ محمد موسیٰ بھٹو: مولانا نانوتویؒ کی بیان کردہ اس بات سے اداروں اور جماعتوں کے حوالے سے ایک بڑا نکتہ جو سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ ادارے اور جماعتیں بانی شخصیت کے جذبات، احساسات، تصورات اور متعین اہداف کے تابع ہوتی ہیں۔ جماعتوں و اداروں کو بانی شخصیتوں کے تصورات و اہداف سے ہٹا کر، ان کی بنیاد میں نئی چیزوں کو شامل کرنا یا ان کے رخ کو دوسری طرف موڑنا عملاً دشوار تر ہی نہیں، بلکہ ناممکنات میں سے ہے، اس لیے کہ اداروں اور جماعتوں کی بنیاد میں بانی شخصیت کے تصورات و اثرات نقش ہو جانے کی وجہ سے انہیں اس کی بنیاد سے جدا نہیں کیا جا سکتا، ادارے اور جماعتیں بے اثر و بے وقعت تو ہو سکتی ہیں اور فنا سے بھی دوچار ہو سکتی ہیں، لیکن بانی شخصیت کے اہداف سے ہٹ کر، ان میں حقیقی بہتری و اصلاح کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ نکتہ ہے جو خاصانِ حق کو تو مشاہد ہوتا ہی ہے لیکن طویل تجربات و مشاہدات بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد اکرم ندوی[۱]

عربی تقریر و تحریر کا ملکہ کیسے پیدا کریں؟

اسلام آباد، پاکستان سے ایک دردمند نے مجھے خط لکھا:

ایک طالب علمانہ سوال کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ حضرت! ہمارے دینی مدارس کے طلبہ، عربی سیکھنے کے لیے تکلم، انشاء اور خطابت کے لیے کون کون سی کتابیں پڑھیں؟ یعنی طالب علم کس کتاب سے شروع کرے اور کس کتاب تک باقاعدہ استاذ سے پڑھے، اور اس کے بعد مطالعہ کے لیے کون سی کتابیں اپنے ساتھ رکھے، جس سے وقتاً فوقتاً رجوع کرتا رہے، تاکہ اس میں فصیح عربی کا ملکہ پیدا ہو جائے اور اپنے مافی الضمیر کا صحیح اظہار تقریر و تحریر میں کر سکے!

جواب: ندوہ لائبریری کے ذریعے آپ جو گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں اس کے لیے آپ شکریہ اور قدردانی کے مستحق ہیں۔ اس وقت پاکستان میں بلکہ دنیا کے ہر ملک میں شدید ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو دعوت دی جائے کہ دین کو مسلکوں اور مشربوں پر، اور کتاب وسنت کو انسانی آرا پر ترجیح دیں، اور جماعتوں اور فرقوں میں بٹنے کی بجائے امت واحدہ بن کر اپنی قوم اور اپنے وطن کو مضبوط بنائیں، اس سمت میں آپ کی لائبریری اہم کردار ادا کر سکتی ہے، آپ صحیح کتابوں کا انتخاب کریں، مطالعہ و تحقیق کی سہولیات فراہم کریں، اور تعمیری موضوعات پر سیمینار کرائیں۔

آپ نے جو سوال کیا ہے، وہ بہت اہم ہے، کوشش کروں گا کہ جواب مکمل ہو، اور تمام مدارس عربی کے لیے مفید ہو۔ آسانی کے لیے یہ جواب تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

صورتِ حال

صورتِ حال جاننا اسی طرح ضروری ہے جس طرح طبیب کے لیے علاج سے پہلے اس شخص کے مرض کی تفصیلات سے واقفیت اہم ہے۔ برصغیر میں ڈیڑھ سو سال کے اندر جو مدارس قائم ہوئے ہیں، انہوں نے عربی زبان (گفتگو، تقریر و تحریر) میں ملکہ پیدا کرنے کو نہ صرف

[۱] ڈائریکٹر آکسفورڈ اسلامک سنٹر، برطانیہ

نصاب تعلیم سے خارج رکھا بلکہ اسے معیوب بنا کر پیش کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک عالم اپنے مدرسے کا شیخ الحدیث ہوتا ہے مگر کسی عرب عالم سے تبادلۂ خیال نہیں کرسکتا، ان واقعات کا مَیں خود شاہد ہوں۔ استاد محترم مولانا نور عالم امینی رحمۃ اللہ علیہ نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک طویل عرصہ قیام کر کے عربی انشا پردازی کے میدان میں غیر معمولی ترقی کی تھی، بعد میں دار العلوم دیوبند میں تدریسی اور صحافتی خدمات انجام دیں۔ انتقال سے چند سال پہلے ایک ملاقات کے دوران میں نے مولانا سے استفسار کیا کہ کیا آپ نے کچھ افراد تیار کیے؟ مولانا نے شکایت اور درد بھرے لہجے میں فرمایا کہ یہاں نہ اس کا ذوق ہے اور نہ اس کا ماحول۔ شروع سال میں کچھ طلبہ آتے ہیں، پھر جلد ہی اس موضوع سے بیزار ہوجاتے ہیں! مَیں نے مدرسہ مظاہر العلوم کے ایک مدرس سے عرض کیا کہ آپ لوگ طلبہ میں عربی زبان وادب کا ذوق پیدا کریں! فرمانے لگے کہ یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ جب بڑے مدرسوں کا یہ حال ہے تو چھوٹے مدرسے کس شمار میں ہوں گے؟ پاکستان اور بنگلا دیش کی صورت حال کچھ مختلف نہیں۔ طوالت کا خوف نہ ہوتا تو وہاں کی بھی کچھ مثالیں دی جاتیں جب کہ اسی برصغیر میں عربی زبان کے بہترین ادباء پیدا ہوئے ہیں جن کی امامت علمائے عرب کے نزدیک بھی مسلّم رہی ہے، ان میں ملا محمود جونپوری، شاہ ولی اللہ، علامہ عبدالحی فرنگی محلی، علامہ عبدالحی حسنی (صاحب نزھۃ الخواطر)، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد رابع حسنی، مولانا محمد الحسنی، مولانا واضح رشید ندوی، مولانا نور عالم امینی ۔۔ وغیرہم خاص طور سے نمایاں ہیں۔

زبان پر قدرت کی اہمیت

زبان کے دو بنیادی وظائف ہیں، جس قدر تقریر وتحریر پر قدرت زیادہ ہوگی اسی کے بقدر وہ دونوں وظائف بخوبی انجام پائیں گے:

فکر: زبان کا بنیادی عمل فکر ونظر کو ترقی دینا ہے۔ انسان زبان ہی کے وسیلے سے سوچتا ہے، الفاظ وتعبیرات کی وسعت، افکار وخیالات کی باریکیوں میں فرق کرنے اور معانی ومفاہیم کی تمیز میں معاون ہوتی ہے۔ فکر ولسان کے اسی گہرے تعلق کی وجہ سے اہل یونان انسان کو

حیوان ناطق کہتے تھے۔قرآن کریم کی آیت ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ یونانی فلاسفہ کے فلسفیانہ تعمق کا راز بھی ان کی زبان دانی ہے۔ وہ سب زبان پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ یہی حال علماے اسلام کا ہے۔امام شافعیؒ نے الرسالہ جیسی کتاب اسی لیے لکھی کہ وہ عربی زبان کے نامور ادیب تھے۔امام محمدؒ، ابن حزم ظاہریؒ، امام غزالیؒ، ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ وغیرہ کے فکری کارناموں کے پیچھے ان کی ادبی زبان بھی ہے۔

تعبیر: زبان کا دوسرا عمل ترجمانی ہے۔ انسان جتنا زبان وبیان پر قادر ہوگا اتنا ہی کامیابی سے اپنے مافی الضمیر کی ترجمانی کرے گا۔ہمیں وہ علماء پیدا کرنے ہیں جو ایک طرف مجتہدانہ فکر کے مالک ہوں اور دوسری طرف فصیح وبلیغ زبان میں اپنے خیالات کو پیش کرنے پر قادر ہوں۔ دنیا کی جن قوموں سے ہمارا مقابلہ ہے ان کی فکری اور فلسفیانہ سطح ہم سے بہت بلند ہے۔ ہماری نااہلی کا نتیجہ ہے کہ مدارس سے اتنی بڑی تعداد میں فارغ ہونے والے علماء یا تو امامت کرتے ہیں، یا وعظ ومیلاد خوانی میں لگ جاتے ہیں یا پھر مناظرہ بازی کرتے رہتے ہیں۔ہم اہل مغرب کی سطح پر کوئی محققانہ کام کرنے پر قادر نہیں ہیں۔مغرب کو چھوڑیں، بلکہ اس وقت ہندوستان اور چین کے غیر مسلم بھی ہم سے بہت آگے ہیں۔

تقریر وتحریر میں ملکہ پیدا کرنے کا طریقہ

تقریر وتحریر میں ملکہ پیدا کرنے کے لیے ہمیں دو کام کرنے ہوں گے:

نصاب کی اصلاح: مدرسوں میں عربی زبان کا جو نصاب ہے وہ نہایت ناکارہ ہے۔ عربی ریڈرز کا کوئی اہتمام نہیں، نحو میں ہدایۃ النحو اور کافیہ پڑھائی جاتی ہیں، دونوں بہت کمزور کتابیں ہیں۔ان کی جگہ ابن ہشام کی کتابیں (شرح قطر الندی، شرح شذور الذہب) وغیرہ داخل کی جائیں۔صَرف میں شذا العرف اور ابن الحاجب کی الشافیہ پڑھائی جائیں۔عربی ریڈرز کو ہر پانچ سال میں بدلا جائے۔ام القری یونیورسٹی نے بہت کامیاب عربی ریڈرز تیار کی ہیں انہیں داخلِ نصاب کیا جائے۔ یہ کتابیں عربی سوم تک پڑھائی جائیں۔ان کے بعد نثر میں مولانا رابع حسنیؒ کی منثورات اور مولانا ابوالحسن ندویؒ کی مختارات اول ودوم، اور نظم میں دیوانِ حماسہ، اور معلّقات وغیرہ پڑھائے جائیں۔

تقریراور گفتگو کی مشق کے لیے ہر مدرسہ میں عربی زبان کی انجمنیں بنائی جائیں جن میں فصیح عربی میں تقریر، مکالمہ وغیرہ کی پابندی سے مشق ہو،اس کے موضوعات ہر ہفتے بدلے جائیں۔

تحریر کے لیے عربی سوم تک ام القری کے اسی نصاب کی تمرینات اچھی طرح کی جائیں۔عربی چہارم سے آخر تک ہفتہ میں دوتین بار اردو سے عربی، اور عربی سے اردو میں مضامین اور خبروں کے ترجمے کرائے جائیں۔ نیز انشا پردازی کی بھی مشق کرائی جائے۔کوشش رہے کہ ہر سال معیار بلند ہوتا رہے، بلکہ سال کے ہر مہینہ ترقی کا خیال رکھا جائے، عالمیت کے آخری سال میں ہر طالب علم سے لازماً عربی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھوایا جائے۔اس کے بغیر سند ہرگز نہ دی جائے۔

خارج نصاب کی تعلیم: تقریر کی مشق کے لیے طلبہ عربی زبان کے اچھے مقررین کی تقریریں سنیں، اور الجزیرہ وغیرہ عربی چینلوں کی خبریں،تبصرے،ثقافتی اور سیاسی پروگرام بھی دیکھیں۔

مزید برآں طلبہ عصر حاضر کے معیاری ادباء کی کتابوں کا مطالعہ کریں،ان میں سے چند کے نام یہاں دے دیے جاتے ہیں: مصطفی لطفی منفلوطی، مصطفیٰ صادق الرافعی، احمد حسن الزیات، طہٰ حسین، احمد امین، عباس محمود عقاد، ابوالحسن علی ندوی، محمد الحسنی، علی طنطاوی، محمود محمد شاکر وغیرہ۔

ان میں سے بعض ادیبوں کی زبان مشکل اوران کا اسلوب قدرے پیچیدہ ہے۔بہتر ہوگا کہ پہلے احمد امین کی حیاتی، طہٰ حسین کی الایام، علی هامش السیرة، مذکرات، علی طنطاوی کی ذکریات، ابوالحسن علی ندوی کی إذا هبّت ريح الإيمان، مولانا مسعود عالم ندوی کی تاريخ الدعوة الإسلامية فى الهند وتطوراتها، محمد الحسنی کی الاسلام الممتحَن پڑھیں، پھر احمد امین کے مقالات (فيض الخاطر)، رافعی کی وحى القلم، منفلوطی کی العَبرات اور النظرات پڑھیں، اس کے بعد ان شاء اللہ اچھا ذوق پیدا ہوجائے گا اور کتابوں کا انتخاب آسان ہوگا۔

ذہن میں رہے کہ نصاب، تعلیم کا صرف ایک ستون ہے، کوشش کریں کہ ہر مدرسہ میں محنتی اور زبان وادب کا معیاری ذوق رکھنے والے اساتذہ ہوں، اس میں کوتاہی نہ کی جائے، ورنہ خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

تعلیم و تربیت مولانا محمد حنیف جالندھری

انٹرنیٹ کا منفی استعمال
نقصانات اور ان سے بچنے کی تدابیر

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ موجودہ دور انٹرنیٹ کا دور ہے۔ اس کی بدولت مختصر وقت اور انتہائی کم لاگت میں دنیا بھر کی معلومات تک انسان کی رسائی آسان ہو چکی ہے۔ اشیائے ضرورت کی خرید و فروخت، رقوم اور پیغامات کی ترسیل، معلومات کے باہمی تبادلے اور دفتری امور سمیت ہمارے بہت سے روزمرہ کے کام ایسے ہیں، جن کی انجام دہی میں ہم انٹرنیٹ سے مدد لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج کے دور میں عوام وخواص کی اکثریت انٹرنیٹ سے کسی نہ کسی درجے میں منسلک اور مربوط ہے۔

جس طرح دنیا کی دوسری چیزیں اپنے اندر مثبت اور منفی ہر دو پہلو رکھتی ہیں اسی طرح انٹرنیٹ کا استعمال بھی مفید اور مضر دونوں گوشے رکھتا ہے۔ اگر ایک طرف اس کا درست استعمال ہماری زندگی میں بے شمار آسانیاں پیدا کر رہا ہے تو دوسری طرف اس کا غلط استعمال ہمیں دینی، دنیاوی، ذاتی، خانگی، سماجی اور اخلاقی اعتبار سے بے پناہ نقصانات سے بھی دوچار کر رہا ہے۔

یوں تو اس ٹیکنالوجی کے منفی استعمال سے وجود میں آنے والے نقصانات کی فہرست بہت طویل ہے، تاہم ان میں سے چند نقصانات اپنی شدت اور ہولناکی کی بنا پر اس قابل ہیں کہ انہیں زیر بحث لایا جائے، ان کی مضرتوں اور خرابیوں سے انٹرنیٹ کے صارفین کو آگاہ وخبردار کیا جائے اور ان سے بچاؤ کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

اس کا سب سے زیادہ شنیع وقبیح نقصان یہ ہے کہ یہ اشاعتِ فاحشہ کا سستا ترین ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے عریاں تصاویر، حیا سوز مناظر اور اخلاق باختہ ویڈیوز تک رسائی انتہائی آسان ہو چکی ہے، اس وقت انٹرنیٹ نوجوان نسل میں اخلاقی قدروں کی تباہی، فرد اور سماج میں شرم وحیا اور غیرت وحمیت کے فقدان ونقصان اور نوجوان مرد وخواتین کے اعلیٰ اخلاقی

روایات اور پاکیزہ اسلامی اقدار سے لاتعلقی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ان گنت والدین انٹرنیٹ کی وجہ سے اپنی اولاد کی اخلاقی حالت کے بگڑ جانے پر پریشان ہیں۔آئے روز اس قسم کے واقعات میڈیا میں رپورٹ ہوتے ہیں کہ سماجی رابطوں کی مختلف ویب سائٹس کے ذریعے پنپنے والے مردوزن کے باہمی تعلق کے نتیجے میں کم عمر اور ناسمجھ خواتین اپنے والدین کو معاشرے میں رسوا کر کے گھر سے فرار ہو کر کسی کی ہوس کا نشانہ بنتی ہیں۔ مرد کے روپ میں موجود جنسی درندے چند دن تک انہیں سبز باغ دکھاتے ہیں اور مطلب برآری کے بعد انہیں بے یارومددگار چھوڑ دیتے ہیں۔

انٹرنیٹ کا ایک بہت بڑا اور ہمہ جہتی نوعیت کا نقصان یہ بھی ہے کہ اس کا صارف وقت جیسی بیش بہا دولت اور قیمتی متاع کو بے دردی کے ساتھ ضائع کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ انٹرنیٹ سے منسلک افراد کی ایک بہت بڑی تعداد گھنٹوں تک سکرین پر نظریں جمائے لایعنی و بے فائدہ اور بسا اوقات ضرر رساں ونقصان دہ چیزوں میں مصروف ومگن رہتی ہے۔ بہت سے طلبہ کرام تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے نام پر انٹرنیٹ سے مربوط ہوتے ہیں اور پھر یہ ٹیکنالوجی رفتہ رفتہ انہیں اپنے جال میں اس طرح جکڑ لیتی ہے کہ وہ اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں، علم کی جستجو اور مطالعے کی لگن ختم ہو جاتی ہے، ذوقِ تحقیق فنا ہو جاتا ہے علمی ونصابی سرگرمیاں پھیکی لگنے لگتی ہیں، کتابوں سے وحشت ہو جاتی ہے، پڑھائی سے دل اُچاٹ ہو جاتا ہے اور بسا اوقات اس کا نتیجہ سرے سے پڑھائی کو خیر باد کہنے کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

انٹرنیٹ کے بکثرت استعمال کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ انسانی صحت پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ انٹرنیٹ میں زیادہ دیر اشتغال کے نتیجے میں انسان ذہنی تناؤ اور نفسیاتی عارضوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لیے کہ جب انسان زیادہ دیر تک ایسی ہیئت میں سکرین پر نظریں جمائے بیٹھا رہتا ہے کہ دماغ کے علاوہ دیگر اعضا ساکن ہوتے ہیں تو سارا بوجھ دماغ ہی پر پڑتا ہے جس کی وجہ سے انسان مختلف نفسیاتی عوارض کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر یہ عوارض مختلف امرض مثلاً شوگر، ہائی بلڈ پریشر، جسمانی سستی وکمزوری اور دیگر قلبی واعصابی بیماریوں کا باعث بنتے ہیں۔ بلکہ جدید تحقیقات سے تو یہ بھی پتا

چلا ہے کہ انٹرنیٹ کے زیادہ استعمال کے نتیجے میں وہ بیماریاں بھی پیدا ہوسکتی ہیں، جو منشیات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں، اس لیے کہ اس کے زیادہ استعمال سے انسانی جسم میں وہی کیمیاوی رطوبتیں پیدا ہوجاتی ہیں، جو نشہ آور چیزوں کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں اور پھر یہ رطوبتیں انسان کو مزید انٹرنیٹ استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہیں، گویا جس طرح ایک منشیات کے عادی انسان کے لیے منشیات کا استعمال ایک مجبوری بن جاتا ہے، اسی طرح انٹرنیٹ کا زیادہ استعمال بھی کسی نشے کی طرح انسان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور پھر انٹرنیٹ کے بغیر انسان بے چینی واضطراب کا شکار ہوجاتا ہے۔

علاوہ ازیں انٹرنیٹ ٹیکنالوجی کے ذریعے اشتعال انگیز، توہین آمیز اور شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً قابل گرفت مواد کی نشرواشاعت، سوشل میڈیا پر اَپ لوڈ کی جانے والی تصاویر کے غلط استعمال، معلومات کی چوری اور ایک گھر میں موجود افرادِ خانہ کے درمیان دوری اور لاتعلقی سمیت درجنوں سماجی برائیاں اور اخلاقی خرابیاں عام ہوتی جارہی ہیں۔ اگر ہم نے انٹرنیٹ کے ذریعے پیدا ہونے والی خرابیوں کے سیلاب بلا خیز کی روک تھام کے لیے مؤثر اقدامات اور سنجیدہ کوششیں نہ کیں تو ہم اپنے معاشرے کو مکمل تباہی سے نہیں بچاسکیں گے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں فرد، خاندان، معاشرہ اور ریاست، ہر ایک کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ ہر فرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو انٹرنیٹ کے غلط استعمال سے بچانے کی فکر کرے۔

انٹرنیٹ سے منسلک ہر شخص کو یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ قرآن وحدیث میں نظر کی حفاظت پر زور دیا گیا ہے اس لیے کہ انتہائی اخلاقی برائیوں تک پہنچنے کا پہلا زینہ نظروں کا غلط استعمال ہی بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں نظر کو ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر قرار دیا گیا ہے اور قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿30﴾ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ﴾ [النور ۲۴: ۳۰، ۳۱]

''مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہی ان کے لیے پاکیزہ ترین طریقہ ہے اور وہ جو کارروائیاں کرتے ہیں اللہ ان سب سے پوری طرح باخبر ہے اور مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔''

ان آیات میں غضِ بصر کے بعد حفاظت فرج کا ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ شرمگاہ کی حفاظت تبھی ممکن ہے۔ جب نگاہ کو پاک رکھا جائے۔ لہٰذا ہر مسلمان فرد خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ انٹرنیٹ استعمال کرتے ہوئے عریانیت و بے حیائی کے تمام مناظر سے اپنی نگاہوں کو محفوظ رکھے۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ "الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته" (مشکوٰۃ)

یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور اس سے اس کے زیر نگرانی رہنے والے افراد کے متعلق پوچھ گچھ کی جائے گی۔ اس حدیث کی روشنی میں والدین اور سربراہانِ خاندان کی ذمہ داری ہے کہ وہ خاندان کے بچوں کو نہ صرف یہ کہ انٹرنیٹ کے منفی استعمال کی خرابیوں سے آگاہ کریں بلکہ ان کی نگرانی بھی کریں کہ وہ انٹرنیٹ کا غلط استعمال تو نہیں کر رہے؟ بچوں کو اس طرح سے آزاد ہرگز نہ چھوڑا جائے کہ وہ جس طرح چاہیں، انٹرنیٹ کا استعمال کریں۔ آج کل اس طرح کے سافٹ ویئر اور ایپس موجود ہیں جن کی مدد سے اپنے موبائل فون کے ذریعے بچوں کی انٹرنیٹ سے متعلقہ سرگرمیوں کی نگرانی کی جاسکتی ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو موبائل فون اور انٹرنیٹ استعمال کرنے کی اجازت دینے سے پہلے ان سافٹ ویئرز اور ایپس سے استفادے کا طریقہ سیکھیں اور پھر بچوں کی آن لائن سرگرمیوں کی کڑی نگرانی کریں۔

اسی طرح والدین اور سرپرستوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو وقت دیں، انہیں اپنے قریب کریں، ان کے ساتھ اپنے تعلقات کو مضبوط اور خوشگوار رکھیں، ان کے لیے جسمانی کھیلوں کے مواقع فراہم کریں اور انہیں انٹرنیٹ کے استعمال کی بوقت ضرورت و بقدر ضرورت ہی اجازت دیں اور وہ بھی اس انداز میں کہ ان کی آن لائن سرگرمیوں پر نظر رکھی

جاسکے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ سائبر کرائم سے متعلق قوانین سے خود بھی آگاہی حاصل کریں اور بچوں کو ان سے آگاہ کریں تاکہ وہ لاعلمی میں کوئی ایسا غیر قانونی عمل نہ کر بیٹھیں جو قانوناً قابل گرفت ہو۔

اوپر کی سطور میں والدین اور سربراہانِ خاندان کے متعلق جن ذمہ داریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ تمام ذمہ داریاں تعلیمی اداروں یعنی مدارس، مکاتب، سکولوں اور کالجوں وغیرہ کے اربابِ انتظام پر بھی عائد ہوتی ہیں کیونکہ "کلکم" کے عموم میں وہ بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری رائے یہ ہے کہ جن تعلیمی اداروں میں دی جانے والی تعلیم کی نوعیت ایسی ہے کہ طالب علم کو انٹرنیٹ کی طرف احتیاج نہیں ہوتی، ان میں تو طلبہ پر انٹرنیٹ اور انٹرنیٹ سے مربوط ومنسلک ہونے کی صلاحیت کے حامل موبائل فون کے استعمال پر سخت پابندی ہونی چاہیے اور جن تعلیمی اداروں میں دی جانے والی تعلیم ایسی ہے جس کے حصول کے لیے انٹرنیٹ کا استعمال کرنا پڑتا ہے، وہاں کے منتظمین پر وہ تمام ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کا ہم نے گزشتہ سطور میں والدین کے لیے ذکر کیا ہے۔

ریاست کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسی تمام سائٹس پر پابندی عائد کرے جو فحاشی وعریانی پر مشتمل مواد کی حامل ہیں۔ سائبر کرائم قوانین کو مزید بہتر اور مؤثر بنائے اور عریانی وفحاشی کی اشاعت کو بھی ان جرائم کی فہرست میں شامل کرے جو سائبر کرائم قوانین کی زد میں آتے ہیں اور ان پر سختی سے عمل درآمد بھی کرے۔

آخری بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ انٹرنیٹ استعمال کرنے کی صورت میں اس کے منفی استعمال سے پرہیز نہیں کرسکتا تو ایسے شخص کے لیے خلوت کے لمحات میں انٹرنیٹ استعمال کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے لہٰذا ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ بوقت ضرورت تو مثبت انداز میں لوگوں کی موجودگی میں انٹرنیٹ سے استفادہ کرلے لیکن بلاضرورت انٹرنیٹ استعمال نہ کرے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں انٹرنیٹ کا استعمال کرتے ہوئے "خُذْ مَا صَفَا دَعْ مَا کَدَرَ" کے اصول پر کاربند رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تعلیم و بیت

ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین [۱]

مجلسِ علمی کراچی۔ایک تعارف

مجلس علمی کراچی کا دفتر آجکل بنوری ٹاؤن واقع ہے۔اس کے ایگزیکٹوڈائریکٹر ڈاکٹر عامر طاسین صاحب ہیں مجلس علمی کی تاسیس مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی خواہش پر اکتوبر ۱۹۳۱ء میں ڈابھیل،سورت،متحدہ ہندوستان میں ہوئی تھی جس کے اخراجات مولانا محمد بن موسیٰ میاں نے برداشت کیے اور بعد میں بھی کرتے رہے۔مولانا سید احمد رضا بجنوری کومجلس کا پہلا ناظم مقرر کیا گیا تھا۔آپ ۱۹۴۷ء میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے داماد بنے۔مجلس علمی کافی عرصے تک جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ذیلی ادارے کے طور پر کام کرتی رہی۔اس سے قدیم دینی کتب اور جدید قیمتی کتب وافر مقدار میں شائع ہوئیں اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اسے تعلیم، تدریس حدیث اور تحقیق سے ہم آہنگ کر کے ایک منفرد اشاعتی ادارہ بنا دیا۔ان کے معاون علما ومحققین میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ،مولانا بدر عالم میرٹھیؒ ،مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ ،مولانا محمد یوسفؒ کامل پوری ،اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ وغیرہم شامل تھے۔جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے صدر مدرس اور مجلس علمی کے سرپرست اعلیٰ مولانا انور شاہ کشمیریؒ ،مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ،مولانا شمس الحق افغانیؒ اور مولانا یوسف بنوریؒ رہے۔حاجی محمد بن موسیٰ صاحب کا کاروبار زیادہ تر ساؤتھ افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں تھا۔وہ ڈابھیل کے ساتھ ساتھ مجلس علمی کا کام جوہانسبرگ میں بھی سرگرمی سے کرتے رہے۔

حاجی صاحب کی جائیدادیں اور کاروبار کراچی میں بھی تھا۔اب تک کی محفوظ معلومات کے مطابق مولانا محمد یوسف البنوریؒ ۱۹۵۱ء میں پاکستان تشریف لے آئے تو ۱۹۵۲ء میں حاجی صاحب نے مولانا بنوریؒ کی سرکردگی میں ''مجلس علمی'' کا ایک مرکز کراچی میں بھی قائم کر دیا۔میری ویدر ٹاور کے نزدیک میاں برادرز کی ملکیتی جائیداد ''بیت الحمد'' (۱۴۰ بندر روڈ

[۱] سیکرٹری جنرل اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد

کراچی) میں اس کا پہلا دفتر قائم ہوااور پاکستان میں اس کے ناظم ڈاکٹر عامر طاسین صاحب کے والد گرامی مولانا محمد طاسین صاحبؒ (م ۱۹۹۸ء) مقرر کیے گئے۔مگر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں دستوری خاکہ کی تیاری کے دوران مولانا گیلانیؒ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحبؒ ہندوستان سے تشریف لائے تو انھوں نے حاجی محمد بن موسیٰ صاحبؒ کے مکان میں قیام فرمایا۔مولانا گیلانیؒ نے ان کا نام حاجی محمد موسی ٹرانسوالی لکھا ہے۔ اندازہ یہ ہے وہ مکان ''بیت الحمد'' ہی ہوگا کیونکہ مولانا نے جو ایڈریس لکھا ہے(۱۴۰ بندر روڈ کراچی) وہ یہی بنتا ہے اور یہیں مجلس علمی پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ جہاں تک مجلس علمی پاکستان کے قیام کی تاریخ کا تعلق ہے تو مفتی محمد رفیع صاحبؒ کے بقول ۱۹۴۸ء والے دستوری خاکے کی تیاری اور پھر قرارداد مقاصد کی تیاری کے مراحل میں کراچی میں دینی کتابیں نایاب تھیں۔صرف ایک لائبریری مجلس علمی میری ویدر ٹاور کے پاس تھی ، کتابوں سے استفادے کے لیے ان حضرات کو بکثرت وہیں جانا پڑتا تھا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لائبریری یا تو پاکستان بنتے ہی قائم ہوگئی تھی یا قیام پاکستان کے حالات پیدا ہونے کے زمانے میں ۱۹۴۷ء یا اس سے کچھ پہلے ہی بنادی گئی تھی۔

میری ویدر ٹاور کراچی میں ایم اے جناح روڈ اور آئی آئی چندریگر روڈ (سابق میکلوڈ روڈ) سے متصل شاہراہ پر سابق کمشنر سندھ ولیم میری ویدر کی حسنِ کارکردگی کی یادگار کے طور پر 1884ء میں تعمیر کروایا گیا تھا۔ولیم میری ویدرسن 1868ء میں سندھ کے کمشنر مقرر ہوئے اور اپنے 10 سالہ دور میں کراچی سمیت پورے سندھ میں ترقیاتی کام کرائے۔ ٹاور کی لمبائی 102 فٹ اونچی ہے۔70 فٹ کی اونچائی پر ایک چاررخی گھڑی آویزاں ہے،جس کے اوپر نقش ونگاری کے لیے یہودیت کا نشان اسٹار آف ڈیوڈ یا ستارہ داؤدی کندہ ہیں۔ اس ٹاور کی بناوٹ میں جودھپوری لال پتھر کا استعمال کیا گیا ہے۔اِسی ٹاور کی وجہ سے پورا علاقہ ٹاور کہلاتا ہے۔اس علاقے کو تجارتی لحاظ سے مرکزی اہمیت حاصل ہے۔مولانا طاسین صاحبؒ کو ثقہ عالم اور منجھے ہوئے محقق ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا سب سے بڑا داماد ہونے کا بھی شرف حاصل تھا۔مولانا بنوری کی چھوٹی صاحبزادیوں کے نکاح بالترتیب مفتی احمد الرحمان ، مولانا حبیب اللہ مختارؒ اور خالد بنوری صاحبان سے ہوئے۔مجلس علمی میں

مولانا طاسین کی تحقیقی و تصنیفی کام میں معاونت کے لیے حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ، علامہ ابوالوفا افغانیؒ، مفتی مہدی حسن شاہؒ جہان پوری، مولانا ادریس میرٹھیؒ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحبؒ اور ڈاکٹر غلام محمد صاحبؒ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ڈابھیل سے مجلس علمی کا ضخیم مکتبہ جو کہ ۳۰ ہزار کتابوں پر مشتمل تھا، آہستہ آہستہ کراچی منتقل کیا گیا اور یہ سلسلہ نومبر ۱۹۵۴ء میں جا کر مکمل ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مجلس علمی پاکستان کی لائبریری میں خاصی معقول حد تک وسعت آ گئی۔ اس کے بعد جلد ہی مجلس علمی کا دفتر اور لائبریری حاجی محمد موسیٰ صاحب کی خاندانی ملکیتی ایک اور بلڈنگ میں منتقل ہو گیا جہاں Mian Brothers wholesale merchants and importers کے نام سے (پہلی منزل، اولڈ الائنس بلڈنگ، پوسٹ بکس نمبر ۴۸۸۳ کراچی) ان کا کاروبار پہلے سے قائم تھا۔ مولانا طاسین صاحب نے مجلس علمی میں 48 سال تک خدمات انجام دیں اور گزشتہ 30 سال سے ان کے صاحبزادے ڈاکٹر عامر طاسین اس کے منتظم (ایگزیکٹو ڈائریکٹر) ہیں۔ 1994 میں میاں برادرز کی کراچی میں موجود جائیداد وراثتی تقسیم کے نتیجے میں فروخت کر دی گئی تو مولانا طاسین صاحب کی تجویز پر میاں فیملی نے بنوری ٹاؤن المدینہ گارڈن میں موجودہ عمارت کا میزینائن فلور خرید کر مجلس علمی کے دفتر اور لائبریری کو یہاں منتقل کرا دیا۔ اس لائبریری سے اب تک کم و بیش چار سو سے زیادہ محقق طلبہ و طالبات پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقات کر چکے ہیں۔ اس وقت یہ مجلس علمی فاؤنڈیشن ہے اور حاجی محمد بن موسیٰ کے پوتے مولانا مفتی محمد احمد میاں اس کے اخراجات مہیا کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر عامر طاسین صاحب نے بہت عمدہ طریقے سے ہمیں مجلس علمی کی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا۔ ہمارے عزیز مولوی صاحبان نے ایک ایسی کتاب کی تصویر بھی بنائی جس پر ڈابھیل کے مکتبہ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ ہم وہاں سے نکلے تو دل و دماغ میں مختلف تصاویر بن رہی تھیں کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ ۱۹۴۸ء کا دستوری مسودہ تیار کرتے ہوئے مجلس علمی میں کس طرح بیٹھ کر مطالعہ کرتے ہوں گے، انہی خوشبوؤں سے معطر ہو کر ہم اگلی منزل کو روانہ ہوئے۔

تعلیم و تربیت

حافظ محمد عمران طحاوی

تربیت ضروری ہے یا تعلیم؟

تعلیم بھی ضروری ہے لیکن تربیت کے بغیر تعلیم بیکار ہے

دورِ حاضر علم کا دور ہے۔ علم جاننے کو کہتے ہیں۔ آئی ٹی کی بے محابا ترقی نے جاننے کے تمام ذرائع کو سمارٹ فون کے ذریعے سمارٹ کر دیا ہے، اتنا سمارٹ کہ اہلِ علم جس طرف جانے سے روکتے تھے اب اسے بھی جاننے کا سامان موجود ہے۔ اہم وغیر اہم کی تمیز قصۂ پارینہ ہوئی۔ خام اذہان، ناقص علم مگر بلند بانگ دعوے آج کا شعار ہے ۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

تعلیم کی یہ بہتات ظاہری چکا چوند کے سوا کچھ نہیں دے پائی۔ اس سمارٹ ٹیکنالوجی نے افراد میں دوری پیدا کر دی ہے، خاندان ٹوٹ رہے ہیں اور سماجی فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ معاشرے میں مثبت تبدیلیاں کم جبکہ منفی رویوں کی بہتات ہوتی جا رہی ہے۔ اخلاقیات کا جنازہ نکل رہا ہے۔ اس لیے کہ آدمی اس سمارٹ مشین کے ساتھ اب مشین ہو گیا ہے۔ علامہ اقبال نے ایک صدی قبل جو کہا تھا آج صد فیصد درست ہو چکا ہے ۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

اس سمارٹ فون نے آپ کے ہاتھ میں بہت سی مشینوں کو یکجا کر دیا ہے۔ ٹی وی، ویڈیوز، نیوز پیپر، سنیما، میوزک، کتابیں، کورسز، کمپیوٹر، ای میل اور دیگر وغیرہ۔

قوم کو تعلیم کی ضرورت ہے یا تربیت کی یہ ایک اہم سوال ہے۔

اس سوال کے جواب سے پہلے ضروری ہے کہ جانا جائے کہ تعلیم اور تربیت میں بنیادی فرق کیا ہے؟ تعلیم علم سے ہے جس کا مطلب جاننا ہے۔ تعلیم اس نظام کو کہتے ہیں جس کے

ذریعے جاننے کا سفر طے کیا جائے اس کا آغاز ''میں نہیں جانتا'' سے ہوتا ہے۔ تعلیم کی اہمیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے؟ لیکن یہ بھی پیش نظر رہے کہ تعلیم سے شعور وآگہی ضرور ملتی ہے لیکن صرف علم سے زندگی نہیں سنورتی۔ تعلیم تربیت کے لیے مہمیز ضرور ہے مگر تربیت خود ایک مسلسل عمل ہے۔ اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں ۔

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی آدمی بناتے ہیں

تربیت آدمی کے شامل ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ لفظ تربیت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا مادہ رب ب ہے۔ سورۃ الفاتحہ قرآن کی پہلی سورۃ ہے اس کی پہلی آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خود کو ربّ العٰلمین کہا ہے۔ ربّ صرف پالنے والا نہیں ہوتا بلکہ ابتداء سے تکمیل تک کے تمام مراحل میں ہر طرح کے ممکنہ انتظامات کر دینا بھی اس کے دائرہ کار میں ہے۔ اللہ نے انسان کو اس دنیا میں صرف پیدا نہیں فرمایا بلکہ انسان کو جینے اور پنپنے کے لیے جو کچھ درکار ہے سب کا انتظام بھی فرمایا۔ غیبی طور پر تربیت کے طور پر اللہ کی ربوبیت کارفرما رہتی ہے مگر انسان کو اختیار دیتے ہوئے کہ ﴿لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا﴾ (تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے) کا قانون بھی جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی زندگی میں اسے کہیں مجبور نہیں کرتا بلکہ ایک مقررہ مدت تک ڈھیل دیتا ہے اور مکمل جینے کے مواقع بھی۔

دوسری جانب اس دنیا میں کون کیا ہے؟ یا کوئی آگے چل کر کیا بنے گا؟ اس میں سب سے زیادہ کردار ہمارے ماں باپ کا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "ما من مولود إلا يولد على الفطرة، فابواه يهودانه، وينصرانه، ويمجسانه، كما تنتج البهيمة بهيمة جمعاء۔" (۱)

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے یہ اس کے ماں باپ ہوتے ہیں جو اسے یہودی، نصرانی، مجوسی بناتے ہیں جس طرح جانور جانور ہی پیدا کرتا ہے۔ جانور کی تو مجبوری ہوتی ہے کہ وہ انسان کی طرح شعور حیات نہیں رکھتا انسان میں تو اللہ نے تخلیقی صلاحیتیں رکھی ہیں لہٰذا انسان کا

---

(۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۶۷۵۵

کردار جانور سے جداگانہ ہونا چاہیے۔

بچے کی پہلی تربیت گاہ ماں باپ ہیں۔ جہاں تربیت کی اتنی اہمیت ہے کہ پوری زندگی کا دین اور نظام اس سے جڑا ہے۔ ہمارے ہاں ماں باپ کی اپنی تربیت نہیں ہوتی، وہ اولاد کی کیا تربیت کریں گے؟ شادی بیاہ کے سارے فنکشن ایک فلم کی طرح فلمائے جاتے ہیں۔ دلہن کو کرین کے ذریعے مصنوعی چاند پر بٹھا کر انٹری کی جاتی ہے یا دیگر فلمیاتی تصور دے کر دیو مالائی دنیا بنادی جاتی ہے۔

شادی کے بعد جن دو افراد کو ایک نئے خاندان کی تشکیل کا ایک عظیم فریضہ سونپا جانا ہوتا ہے انہیں اپنے فرائض منصبی کا علم ہی نہیں ہوتا۔قوم کی تشکیل افراد کرتے ہیں۔افراد سازی میں ہمارا کوئی حصہ نہیں۔شادیاں ہورہی ہیں اور ساتھ بربادیاں بھی ہورہی ہیں صاحبو! ایک باپ کیسا ہوگا اور ایک ماں کیسی ہوگی؟ کچھ تربیت نہیں! مکتب تو بچے کا بہت بعد میں آتا ہے، پہلی تربیت گاہ گھر ہے۔دعائیں سکھانے یا نظمیں پڑھانے سے کیا تربیت ہوتی ہے؟ حضرت ابراہیمؑ کی خلت اور آپ کے فرزند اسماعیلؑ کی تابع داری مشہور ہے کہ کس طرح آپ والد کی غیر موجودگی کے باوجود ایک نفیس شخصیت رکھتے تھے اس کو علامہ اقبال نے اپنے شعر میں یوں بیان کیا۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سِکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی

ظاہر ہے یہ آدابِ فرزندی اس عظیم ماں کے ہی سکھائے ہوئے تھے جس نے وادئ غیر ذی زرع میں بھی شکر کا دامن نہ چھوڑا۔صبر اور شکر جس کی شخصیت کا حصہ نہ ہو وہ کچھ نہیں بن سکتا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکی زندگی میں سب سے زیادہ مسلمانوں کو صبر اور شکر کی تربیت دی۔آج ہم اپنی پاکستانی قوم کو دیکھیں تو بے صبرا پن اور ناقدری میں ہم سب سے آگے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ بحیثیت والدین اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور بچوں کی ذمہ دارانہ تربیت کریں۔انہیں ناکارہ نہ بنائیں۔

راولپنڈی کے مشہور گارڈن کالج کے پرنسپل پروفیسر آر آر اسٹیوارٹ نے پاکستانی قوم کو پڑھایا ہے۔انہیں ان کی عظیم خدمات کے تشکر کے طور پر ستارہ امتیاز سے نوازا گیا۔ یہ اس قدر

پُرعزم تھے کہ پاکستان سے جانے کے بعد بھی 1981ء تک مشی گن یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ ان کا انتقال 103 سال کی عمر میں 1993ء میں کیلیفورنیا میں ہوا۔ یہ اور ان کی بیگم دونوں پچاس سال پاکستانی قوم کو پڑھاتے رہے ہیں۔

پروفیسر اسٹیوارٹ نے 1960 میں اپنی الوداعی تقریب میں اس خطے کے بارے میں ایک عجیب بات کہی۔ اس نے کہا کہ ’’پاکستانی ایک نا کارہ اور مفلوج قوم ہیں‘‘۔

اس کا کہنا تھا ’’اس قوم کے نونہالوں کو پہلے ان کی مائیں نکما بناتی ہیں۔ یہ اپنے بچوں کا ہر کام خود کرتی ہیں، ان کے کپڑے دھوتی ہیں، استری کرتی ہیں، بچوں کو جوتے پالش کر کے دیتی ہیں، لنچ باکس تیار کر کے بچوں کے بستوں میں رکھتی ہیں اور واپسی پر باکسز کو نکال کر دھو کر خشک بھی خود کرتی ہیں۔

بچوں کی کتابیں اور بستے بھی مائیں صاف کرتی ہیں اور ان کے بستر بھی خود لگاتی ہیں چنانچہ بچے نا کارہ اور سست ہو جاتے ہیں اور یہ پانی کے گلاس کے لیے بھی اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو آواز لگا دیتے ہیں یا ماں کو اونچی آواز میں کہتے ہیں: امی پانی تو دے دو۔ پاکستانی بچے اس کلچر کے ساتھ جوان ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی بیویاں آ جاتی ہیں۔ یہ انھیں اپنا مجازی خدا سمجھتی ہیں اور غلاموں کی طرح ان کی خدمت کرتی ہیں۔ یہ بھی ان کا کھانا بناتی ہیں، کپڑے دھو کر استری کرتی ہیں۔ ان کے واش رومز صاف کرتی ہیں، ان کے بستر لگاتی ہیں اور پھر ان کی نفرت، حقارت اور غصہ برداشت کرتی ہیں۔ چنانچہ مَیں اگر یہ کہوں پاکستانیوں کی مائیں، بچوں کی نرسیں، بیویاں، ملازمائیں اور چھوٹے بہن بھائی غلام ہوتے ہیں تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ لہٰذا سوال یہ ہے جو لوگ اس ماحول میں پل بڑھ کر جوان ہوتے ہیں کیا وہ نا کارہ اور مفلوج نہیں ہوں گے؟‘‘ پروفیسر اسٹیوارٹ کا کہنا تھا ’’اگر تم لوگوں نے واقعی عظیم قوم بننا ہے تو پھر تمہیں اپنے بچوں کو شروع سے اپنا کام خود کرنے اور دوسروں بالخصوص والدین کی مدد کی عادت ڈالنا ہوگی تا کہ یہ بچے جوانی تک پہنچ کر خود مختار بھی ہو سکیں اور ذمے دار بھی۔ تم خود فیصلہ کرو جو بچہ خود اٹھ کر پانی کا گلاس نہیں لے سکتا وہ کل قوم کی ذمے داری کیسے اٹھائے گا؟‘‘۔

(بقیہ صفحہ نمبر: ٦٢)

تفہیم دین

ادارہ

مسلم معاشرے اور اسلامی سیکولرزم

مسلم معاشروں میں صرف نماز، روزے، داڑھی کو اسلام سمجھا جاتا ہے
اخلاق، معاشرت اور معیشت میں اسلامی اصولوں پر عمل نہیں ہوتا

جارج واشنگٹن یونیورسٹی کے پروفیسر حسین عسکری نے تحقیق کی کہ اسلامی ممالک کیسے اسلامی ہیں؟ اسلام میں ریاست اور معاشرے کے قوانین پر عمل کرنے والے ممالک کو تلاش کرنے سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنی روزمرہ زندگی میں اسلامی احکام پر عمل کرتے ہیں وہ مسلمان ممالک نہیں ہیں۔

اس تحقیق سے پتا چلا ہے کہ سب سے زیادہ اسلام کی تعمیل کرنے والا ملک نیوزی لینڈ ہے جس کے بعد لکسمبرگ ہے۔ اس کے بعد آئرلینڈ، آئس لینڈ، فن لینڈ، ڈنمارک چھٹے اور کینیڈا ساتویں نمبر پر رہے۔

ملائیشیا 38ویں، کویت 48ویں، بحرین 64ویں اور حیران کن طور پر سعودی عرب 131ویں نمبر پر رہے۔ گلوبل اکانومی جرنل میں شائع ہونے والی اس تحقیق میں * بنگلہ دیش کی پوزیشن سعودیوں سے نیچے ہے۔

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ مسلمان نماز، روزہ، سنت، قرآن، حدیث، حجاب، داڑھی، لباس کے بارے میں بہت محتاط ہیں لیکن ریاستی، سماجی اور پیشہ ورانہ زندگی میں اسلام کے قوانین پر عمل نہیں کرتے۔

مسلمان دنیا میں کسی سے بھی زیادہ مذہبی خطبات، واعظ نصیحتیں سنتے ہیں۔ پچھلے ساٹھ سالوں میں مسلمانوں نے جمعہ کا خطبہ کم از کم 3000 مرتبہ سنا ہے لیکن کوئی بھی مسلمان ملک دنیا کا بہترین ملک نہیں بن سکا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایک غیرت مند چینی تاجر نے کہا کہ مسلمان تاجر ہمارے پاس

دو نمبر کی جعلی چیزیں بنانے کا آرڈر لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں مشہور کمپنی کا لیبل لگاؤ۔ بعد میں جب میں نے ان سے کہا کہ ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ تو انہوں نے کہا کہ یہ حلال نہیں ہے اس لیے میں نہیں کھاؤں گا۔ تو کیا نقلی اشیاء بیچنا حلال ہے؟

شیخ محمد عبدہٗ نے کہا کہ مَیں مغربی ممالک میں غیر مسلموں کو اسلام کے اصولوں پر چلتے ہوئے دیکھتا ہوں اور مسلم ممالک میں مَیں اسلام کو دیکھتا ہوں لیکن مسلمان نہیں ہیں۔

اسلام صرف نماز اور روزہ نہیں ہے بلکہ یہ زندگی گزارنے کا ایک طریقہ ہے اور دوسروں کے ساتھ رابطے اور رفاقت کا معاملہ ہے۔ جو شخص روزہ دار ہے، نماز پڑھتا ہے اور اس کی پیشانی پر نشان ہے وہ اللہ کے نزدیک منافق ہوسکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حقیقی پرولتاریہ اور خالی ہاتھ وہ لوگ ہیں جو روزے، نماز، کثرت حج، صدقات کے ساتھ حاضر ہوں گے لیکن بدعنوانی، مال ہتھیانے کی وجہ سے خالی ہاتھ جہنم میں جائیں گے۔ دوسروں کو ان کے جائز حقوق نہ دینا اور لوگوں پر ظلم کرنا انہیں برباد کر ڈالے گا۔

اسلام کے دو حصے ہیں، ایک ایمان کہلانے والے عقیدے کا عوامی اعلان اور دوسرا احسان نامی ایمان کا موضوع جو کہ صحیح معاشرتی اصولوں پر عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر دونوں پر عمل نہ کیا جائے تو اسلام ادھورا رہ جاتا ہے جو ہر نام نہاد مسلم ملک میں ہو رہا ہے۔

مذہبی ممنوعات کی پابندی انسان کی ذاتی ذمہ داری ہے اور یہ اللہ اور بندے کے درمیان معاملہ ہے۔ لیکن معاشرتی اصولوں کی پابندی ایک بندے اور دوسرے کے درمیان معاملہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر مسلمان اپنی زندگیوں میں اسلامی اصولوں پر عمل نہیں کریں گے تو مسلم معاشرہ بگڑ جائے گا اور ہمارا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔

لارڈ برنارڈ شا نے ایک بار کہا تھا کہ ''اسلام بہترین مذہب ہے اور مسلمان بدترین پیروکار ہیں''۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام پر عمل پیرا ہونے کی توفیق بھی کیسے عطا فرمائے جب ہم نے کبھی کوشش ہی نہیں کی؟

تفہیمِ دین

مولانا یحییٰ نعمانی (لکھنؤ)

غامدی فکر کی بنیادی گمراہی کیا ہے؟

یہ انکارِ سنت ہے اور یہی سب سے اہم ہے

گزشتہ تقریباً بیس سال سے جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار کا ذرائع ابلاغ میں چرچا خاصا سرگرمی سے جاری ہے۔ یہ عاجز ان کی چیزیں اس وقت سے پڑھتا اور دیکھتا آیا ہے۔ جب غالباً ہندوستان میں ان کو معدودے چند لوگ جانتے تھے۔ ان کا رسالہ ''اشراق''، ''الفرقان'' میں آتا تھا اور کم از کم ۱۹۹۱ء سے ۲۰۰۸ء تک نظر سے گزرتا رہا، وہ اپنی نسبت محترم مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی طرف کرتے ہیں۔ میں ان کی چیزیں پڑھ کر محسوس کرتا تھا کہ مولانا مرحوم نے ''حدرجم'' کے سلسلے میں جس خطرناک جرأت اور شذوذ پر انتہاء کی ہے، غامدی صاحب نے وہاں سے اپنا آغاز کیا ہے، پھر انٹرنیٹ نے ان کے افکار کی تبلیغ کا دائرہ بہت وسیع کر دیا۔ ادھر کچھ عرصے سے ملک کے مختلف علاقوں میں لوگ ان کے بارے میں پوچھا کرتے تھے اور یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ان کے لیکچرز سے کچھ لوگ ہمارے یہاں بھی متاثر ہونے لگے ہیں۔

مغربی تہذیب کے بین الاقوامی غلبے اور پھیلاؤ کی وجہ سے مسلمانوں میں ہر جگہ ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا ہے، جس کو اپنے مسلمان ہونے کے باوجود، اپنے خاص ماحول کے زیر اثر علماء اور اہل دین سے ایک نفسیاتی الجھن اور ذہنی دوری ہے، ایسے لوگ ہر گمراہ کن تحریک و دعوت کے سب سے جلد شکار ہو جاتے ہیں، تجربہ ہو رہا ہے کہ یہی طبقہ غامدی صاحب سے متاثر ہو رہا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ انٹرنیٹ کے ذریعے ہر متعدی مرض وباء کی طرح پھیلتا ہے، یہ بھی اسی طرح پھیل رہا ہے لیکن ابھی مورخہ ۱۳/اپریل ۲۰۱۹ء کو معلوم ہوا کہ ان کے ادارے ''المورد'' کی بھارتی شاخ قائم ہو چکی ہے، جہاں سے ان کی کتابیں، رسائل اور ویڈیو لیکچرز وغیرہ کی نشر و اشاعت کا کام ہو رہا ہے۔ اب مجھے اپنی دینی ذمہ داری محسوس ہوئی کہ ان کے فکر کی بنیادی گمراہی کو واضح طور پر پیش کیا جائے تا کہ ان کی چیزوں سے سننے اور پڑھنے والا

واقف ہو کہ اُن کے افکار کی اصل بنیاد کس غلط فکری پر ہے اور ان کی آراء کیوں دین کی صحیح بنیادوں سے ہٹی ہوئی ہیں۔

جناب جاوید احمد غامدی صاحب کی گمراہی اور اہلِ سنت و اہلِ حق سے ان کا اصل انحراف کوئی معمولی قسم کا نہیں ہے۔ افسوس کہ وہ مقام رسالت کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کے نزدیک بنیادی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے اہل ہی نہیں کہ اُن کے ذریعے (قرآن کے علاوہ) دین کا کوئی عقیدہ یا عمل انسانوں کو دیا جائے۔ وہ منصبِ رسالت کا یہ مقام تسلیم نہیں کرتے کہ وہ دین کا کوئی حکم قرآن کے علاوہ جاری کرے۔ ہاں! مشرکینِ مکہ اور یہود ونصاریٰ میں جو دینی روایت جاری چلی آ رہی تھی غامدی صاحب کے نزدیک رسول اس کو اصلاح وتجدید کے ساتھ جاری کرسکتا تھا لیکن اللہ اپنے رسول کو اپنے بندوں کے لئے کوئی نیا اور مستقل حکم دے اور وہ دین اسلام کا کسی درجے کا بھی حصہ قرار پائے یہ نبی ورسول کا منصب و مقام نہیں ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ حدیث کے ذریعے دین کا کوئی نیا حکم ثابت نہیں ہوتا۔ وہ واضح طور پر منکرِ حدیث ہیں البتہ ان کے انکار حدیث کی نوعیت مشہور عام منکرین حدیث سے قدرے مختلف اور نسبتاً کم درجے کی ہے۔ ان کے فکر کی شاید سب سے بنیادی کتاب ''میزان'' ہے۔ اس میں انہوں نے بڑی صراحت کے ساتھ اور کسی اشتباہ کے بغیر صاف واضح کیا ہے کہ حدیث دین کا ماخذ ہے ہی نہیں۔

غامدی صاحب تحریر فرماتے ہیں ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کی جو روایتیں زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنہیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا'' کیا اس جملے میں کسی ایسی تاویل وتوجیہ کی کوئی گنجائش ہے جس کے ذریعہ یہ کہا جا سکے کہ غامدی صاحب منکر حدیث نہیں ہیں؟ اور پڑھیے، اس جملے کے معاً بعد تحریر کرتے ہیں، ''اس مضمون کی تمہید میں ہم نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے'' (میزان: ص:۶۱، ایڈیشن ۲۰۱۴ء) کیا اب بھی کوئی اشتباہ باقی رہ جاتا ہے؟ ہاں! یہاں ایک چیز غور کرنے لائق

ضرور ہے۔مندرجہ بالاعبارت میں غامدی صاحب نے حدیث کے بارے میں یہ بات کہہ کر کہ حدیث کے ذخیرے کی زیادہ تر روایات اخبار آحاد ہیں، غالباً یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ حدیث کو دین میں حجت نہیں مانتے اس کا سبب ان کا خبر واحد ہونا ہے، اس طرح ان کے موقف کا شذوذ واجنبیت اور عام مسلمانوں کے لیے اس سے وحشت کم ہو جائے گی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس عبارت میں اخبار آحاد کا لاحقہ بس ایک ''شئِ زائد'' ہے۔ غامدی صاحب کے یہاں متواتر حدیث سے بھی دین کا کوئی نیا عقیدہ یا عمل ثابت نہیں ہوتا۔ اوپر مذکور ان کی عبارت میں غور کیجیے! ''یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے''۔ یہاں غامدی نظریے کی ایک خاص بنیاد اور جان لیجئے! جس سے اوپر کی عبارتوں میں حدیث کے بارے میں ان کے الفاظ کہ اس سے ''عقیدہ وعمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا'' اور یہ بات کہ حدیث ''دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ نہیں بن سکتی'' کا پورا مفہوم سمجھ میں آسکے، جناب غامدی صاحب نے اپنی اس کتاب میں (جواُن کے فکر کی بنیاد ہے) بتایا ہے کہ دین ہم تک دوصورتوں سے پہنچا ہے (۱) قرآن مجید (۲) سنت

دھوکہ نہ کھا جایئے گا! صحابہ سے لے کر آج تک مسلمان سنت سے جس حقیقت کو مراد لیتے ہیں اور جس کا نام لیتے ہیں ذہن وتصور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے ملنے والی احادیث واعمال کا خیال آتا ہے، غامدی صاحب کے یہاں سنت اس معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ کچھ اور ہی تصور ہے، غامدی صاحب فرماتے ہیں ''سنت سے ہماری مراد دینِ ابراہیمی کی وہ روایت ہے (جو عرب کے مشرکین اور یہود ونصاریٰ میں چلی آرہی تھی) جسے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں جاری کیا'' (میزان: ص ۱۴)۔اسی مقام پر غامدی صاحب کہتے ہیں کہ دین کے ماخذ بس یہی دو ہیں اور کچھ نہیں، فرماتے ہیں ''دین لاریب، انہی دوصورتوں میں ہے، ان کے علاوہ کوئی چیز دین ہے نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کے اخبار آحاد جنہیں بالعموم ''حدیث'' کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ ان کی تبلیغ وحفاظت کے لئے آپ نے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا بلکہ سننے اور دیکھنے والوں کے لیے چھوڑ دیا ہے کہ چاہیں تو انہیں آگے پہنچائیں اور چاہیں تو نہ پہنچائیں، اس لیے

دین میں ان سے کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا" (ص:۱۵)

غامدی صاحب کی بنیادی گمراہی انکارِ حدیث ہے، وہ ایک نئے طرز کے منکرِ حدیث ہیں۔ مجھے بڑا قلبی قلق رہا کہ جس وضاحت کے ساتھ اور متعین و دوٹوک (Pin Point) نشاندہی کے ساتھ ان کی یہ گمراہی عوام کے سامنے آنی چاہیے تھی، نہیں آئی۔ پاکستان میں ان کے افکار مختلف رسائل اور حلقوں میں زیر بحث آتے رہے۔ حیرت ہوتی تھی کہ ان کے افکار کے تجزیے میں اہل حق کی نمائندگی کرنے والوں نے نہ جانے کیوں ان کی تردید میں بڑی لمبی چوڑی بحثیں کیں؟ جبکہ اس کی ضرورت نہیں تھی، غامدی صاحب صرف انکار حدیث کے اس نظریے کا اظہار ہی نہیں کرتے بلکہ اس کی عملی تطبیق بھی اس طرح کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بیان کئے ہوئے وہ تمام حقائق وواقعات اور وہ تمام احکام جو قرآن میں نہیں ہیں اور جن کو وہ ملت ابراہیمی کی پچھلی روایت میں بھی نہیں پاتے ان کو صاف دین وشریعت کا حصہ ماننے سے انکار کردیتے ہیں۔ غامدی صاحب کے اس تصور دین کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعض ایسے عقائد کا بھی انکار کیا گیا جو متواتر احادیث سے ثابت ہیں اور جن کے انکار پر یقینی طور پر لازم آتا ہے کہ آدمی نے ایسی بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے یقینی اور قطعی طور پر بتائی تھی، اِس کی وجہ یہ ہے کہ غامدی صاحب کہہ چکے ہیں کہ ملت ابراہیمی کی جو روایت رسول اللہ ﷺ نے دین کی حیثیت سے جاری فرمائی اس کا نام ''سنت'' ہے اور اس کا دائرہ صرف اور صرف اعمال کی حد تک ہے، عقیدہ کی کوئی قسم اس سے ثابت نہیں ہوسکتی (میزان: ص ۵۸) ان کے نزدیک حدیث اِس سنت کے علاوہ ہے اور جیسا کہ اوپر گزر چکا ان کے نزدیک حدیث سے دین میں کوئی عقیدہ یا عمل ثابت نہیں ہوسکتا یعنی رسول اللہ ﷺ نے جو باتیں آخرت، جنت، جہنم اور دیگر عقائد کے سلسلے میں ارشاد فرمائیں اور عالم غیب کے جن بے شمار واقعات وحقائق کی خبر دی (چاہے ان کی روایت متواتر ومشہور اور صحیح ہی کیوں نہ ہوں) ان سے دین اور اس کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا، ان کے نزدیک یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین کے کسی عقیدے یا حکم کا ماخذ بن سکے۔

قارئین کرام! غور فرمائیں کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ آپ ﷺ ساری زندگی اپنی مجلسوں میں جو گفتگو فرماتے رہے اور عالمِ غیب کی جو تفصیلی خبریں دیتے رہے اگر ان کا دین

سے کوئی تعلق (بقول غامدی صاحب) نہیں ہے تو کیا وہ سب فضول اور بے مطلب باتیں تھیں؟ مجھے پاکستان کے بعض ان جلیل القدر علماء پر شدید حیرت ہے، جنہوں نے اس جیسی گمراہی اور کج فکری کی تردید میں بڑی لمبی چوڑی علمی گفتگو کر کے غامدی صاحب کو کسی سنجیدہ علمی گفتگو کا مستحق سمجھا؟ اور ان کے ان نامعقول افکار پر فلسفیانہ گفتگوئیں کیں۔ اب غور فرمائیے وہ تمام احادیث جن میں مثلاً پل صراط اور حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول وغیرہ کی خبر دی ہے، غامدی اصولِ دین میں ان میں سے کسی پر دینی عقیدہ اور یقین رکھنا غلط ہے، اس لیے کہ حدیث کی یہ ''مجال''، ہی نہیں کہ وہ ہمیں کوئی عقیدہ دے سکے۔ واضح رہے کہ یہ وہ حقائق اور اخبار ہیں جن کی حدیثیں متواتر طور پر رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ثابت ہیں یعنی صحابہ سے لے کر بعد کی نسلوں تک ہر زمانے میں اس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے نقل کرنے والے اتنے لوگ رہے ہیں کہ ان کا کسی کذب بیانی یا غلط فہمی پر متفق ہونا عقلاً محال اور ناممکن ہے اور یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان چیزوں کی خبر دی ہے اور اپنی امت کو ان کے بارے میں بتایا ہے، ایسی چیزوں کو علماء کی اصطلاح میں ''ضروریات دین'' کہتے ہیں یعنی وہ باتیں جن کے بارے میں بدیہی یقین کے درجے میں یہ بات ثابت ہے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اور ان کی بابت اپنی امت کو تعلیم دی ہے، علماء امت کا اجماع واتفاق ہے کہ ان ''ضروریات دین'' میں سے کسی ایک بات کا انکار کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے، علم کلام واصول اور دیگر اسلامی علوم کی کتابوں میں اس مسئلے کو پوری وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر دور میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف "اکفار الملحدین" میں اس سلسلے میں عقل صریح کی روشنی میں اور علمائے امت کی بے شمار تصریحات جمع کر کے ہر صاحب فہم کے لیے مسئلے کو بے غبار کر دیا ہے۔ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وہ ارشادات، جن کو ہر نسل میں اور ہر دور میں اتنے بہت سے لوگ نقل کرتے آئے ہوں، جن کے جھوٹ پر متفق ہونے اور سازش کرنے کی بھی گنجائش نہ ہو اور نہ یہ ممکن ہو کہ اتنے بہت سے لوگوں نے بات سمجھنے اور نقل کرنے میں غلطی کی ہو تو پھر ایسے ارشادات کو تسلیم نہ کرنا اور ان کے خلاف عقیدہ و فکر رکھنا سوائے اس کے کچھ نہیں کہ خدا کے رسول کی تکذیب و تغلیط کی گئی ہے "ربنا آمنا بما انزلت واتبعنا الرسول فاکتبنا مع الشاھدین"۔

اپنے اسی اصول کی وجہ سے غامدی صاحب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور نزول ثانی کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی، اب نہ وہ زندہ ہیں نہ قیامت سے قبل دوبارہ تشریف لائیں گے (میزان: ۱۷۸) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی حیات اور قیامت سے پہلے دوبارہ دنیا میں تشریف لانے کے بارے میں یقینا خبر دی ہے اور پوری صراحت کے ساتھ دی ہے اور آپ سے اس کی روایات متواتر ہیں یعنی اتنے بہت سے راویوں نے ہر دور میں بیان کی ہیں جن کے غلطی کرنے کا امکان بھی نہیں ہے، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی کتاب ''التصریح بما تواتر فی نزول المسیح'' میں ان روایات کو جمع کر دیا گیا ہے، جس کے بعد اس میں شبہ نہیں رہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یقینا حضرت مسیح علیہ السلام کے قبلِ قیامت دنیا میں تشریف لانے اور عظیم کارنامے انجام دینے کی خبر دی تھی مگر غامدی صاحب کے یہاں اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہے اور ان کے دنیا میں دوبارہ تشریف لانے کا عقیدہ بے حقیقت ہے (میزان: ۱۷۸۔۱۸۰) اگر چہ یقینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی خبر دی ہے مگر ان کے نزدیک یہ چیز تو حدیث کے دائرے میں ہی نہیں آتی ہے کہ اس سے دین میں کسی عقیدے یا عمل کا اضافہ ہو سکے۔

عقائد ہی کی طرح غامدی صاحب کے دین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیے ہوئے ان احکام وقوانین کا کوئی درجہ نہیں ہے جن کی اصل قرآن میں نہیں ہے اور جو ''دین ابراہیمی کی روایت'' میں انہیں نہیں ملتے۔ ہم زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتے اس لیے کہ انہوں نے اپنے فکر وتصور دین کا جو اصول پوری وضاحت اور قطعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اس سے خود بخود وہ تمام واجبات ومحرمات اور سنن ومستحبات دین کی فہرست سے خارج ہو جاتے ہیں جن کی اصل قرآن میں نہ ہو اور جو دین ابراہیمی کی روایت کی حیثیت سے رائج نہ رہی ہوں مثلاً بے شمار احکام ایسے ہیں جن کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں آیا ہے اور نہ ان کا کوئی سراغ ''دین ابراہیمی کی روایت'' میں اس طور پر ملتا ہے کہ عرب یا یہود ونصاریٰ ان پر کار بند تھے مثلاً سونے کے برتنوں میں کھانا پینا حرام ہے، مردوں کے لئے سونا اور ریشم کے لباس حرام ہیں،

عورتیں ماہواری ایام میں نماز نہیں پڑھیں گی اور بعد میں ان کی قضاء بھی نہیں کریں گی، داڑھی رکھنا اور بڑھانا واجب ہے، بات کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، وغیرہ نہ جانے کتنے حلال وحرام کے احکام ہیں جو غامدی صاحب کے اصول کے ذریعے دین کا حصہ نہیں رہیں گے اور ''خارج از اسلام'' قرار پائیں گے۔ ان کے تصورِ دین اور فکری اصول کا لازمی تقاضہ یہی ہے۔ غامدی صاحب کا حلقہ یہاں ایسے مقامات پر احادیث کی کچھ تاویل وتوجیہ یا تضعیف یا قرآنی آیات سے ان کے خلاف استدلال کی کچھ کوششیں کرتا ہے مگر ان کو اس تکلف کی ضرورت ہی کیوں ہے؟ وہ مختصر یہ ہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہمارے عقیدے میں حدیث سے دین میں کسی عقیدے یا عمل کا اضافہ نہیں ہوسکتا؛ اس لئے ہم ان باتوں کو نہیں مانتے مگر عموماً وہ اور ان کے متبعین اپنا عقیدہ صاف کہنے کے بجائے پردہ داری سے کام لیتے ہیں، اسی پردہ داری کی وجہ سے ہم کو ان کے فکر کی اس بنیادی گمراہی کو کھولنا پڑ رہا ہے۔ (جاری ہے)

دین لوگوں کی نظروں میں ہلکا کیوں ہوگیا ہے؟

میں نے لوگوں کے احوال کا جائزہ لیا تو بڑا ہی عجیب معاملہ پایا۔

وہ گھروں کے اجڑنے پر روتے ہیں، پیاروں کی موت پر آہیں بھرتے ہیں، معاشی تنگ دستی پر حسرتیں کرتے ہیں اور زمانے کو برا بھلا کہتے ہیں۔

حالانکہ وہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کی عمارت گر رہی ہے، دین فرقوں میں بٹ چکا ہے، سنتیں مٹ رہی ہیں اور بدعات کا غلبہ ہے، گناہوں کی کثرت ہے۔

لیکن ان میں سے اپنے دین کے لیے رونے والا کوئی نہیں ہے، اپنی عمر برباد کرنے پر کسی کو افسوس نہیں ہے، اپنے وقت کو ضائع کرنے پر کوئی غم نہیں ہے۔

اور مَیں اس سب کا ایک ہی سبب دیکھتا ہوں کہ دین ان کی نظروں میں ہلکا ہوگیا ہے اور دنیا ان کی فکروں کا محور بن چکی ہے!

امام ابن عقیل الحنبلیؒ (الآداب الشرعیۃ لابن مفلح: ۳/ ۲۴۰)

تفہیم دین سید خالد جامعی

ادارتی قربانی کے مسائل

مفتی محمد معاذ اشرف: قربانی عبادت ہے، فریضہ ہے، یہ کاروبار نہیں ہے۔

مفتی محمد نعیمؒ: ''چند اداروں میں اجتماعی قربانی کا مقصد خدمت خلق نہیں، معاش کا حصول ہے۔''

مفتی احمد صدیقی: اداروں کو قربانی کی ذمہ داری دینے کی بجائے قربانی کا فریضہ صحیح طریقے سے ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لوگ علماء کی رہنمائی میں انفرادی اور نجی اجتماعی قربانی کا اہتمام کریں۔

مولوی احتشام صدیقی: وکیل کے ذریعے قربانی کی اجازت کا مطلب کیا یہ ہے کہ پورا شہر اور پورا ملک وکیل ہی کے ذریعے قربانی کا فریضہ ادا کرے؟ قربانی کے سنن و مستحبات کی ادائیگی کا حکم فرد کو دیا گیا ہے ادارے کو نہیں۔

مفتی محمد معاذ اشرف: اداروں کی جانب سے اجتماعی قربانی کے نتیجے میں اب بڑی بڑی کمپنیاں میدان میں آگئی ہیں اور ایسی سہولیات فراہم کررہی ہیں جو کمزور ادارے مہیا نہیں کرسکتے مثلاً گوشت آئس باکس میں گھر پر پہنچانے کا انتظام، قربانی کے ہر حصے کی الگ کٹائی۔ یہ ادارے مدارس کو ملنے والی کھال سے محروم کررہے ہیں۔

تین سال پہلے مولوی احتشام صدیقی صاحب نے اداروں کی جانب سے ہونے والی قبربانی کی رسم میں مضمر خطرات، خدشات، امکانات پر ایک سوال نامہ ہمیں بھیجا تھا۔ ہم مفتی نہیں لہٰذا ہم نے یہ استفتاء علماء کرام کی خدمت میں پیش کردیا کہ وہ اس ضمن میں امت کی رہنمائی فرمائیں لیکن اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔ استفتاء میں جن خطرات کی نشاندہی کی گئی تھی وہ پورے ہوگئے اور کراچی میں کمرشل بنیادوں پر بڑی بڑی کمپنیوں نے قربانی کرنے والوں کا وکیل بن کر قربانی کو ایک بڑے منافع بخش کاروبار میں بدل دیا ہے۔ مولوی احتشام صاحب نے اپنے سوال میں توجہ دلائی تھی ''کراچی میں کچھ کمپنیوں نے یہ کام شروع کردیا ہے یہ کام اگر بڑھا اور پھیلا تو اجتماعی قربانی کے اداروں سے یہ کام نکل کر ان کمپنیوں کے ہاتھ میں چلا جائے

گا۔ ان کی خدمت اور معیار جس درجے کا ہوگا ظاہر ہے وہ معیار اجتماعی قربانی کے ادارے مہیا نہیں کر سکتے، کیا ہم اس وقت ان کمپنیوں کی مخالفت کر سکیں گے اور عوام کو یہ پیغام دینے کے قابل رہیں گے کہ قربانی کرنے کا حکم فرد کو دیا گیا ہے اداروں کو نہیں۔ وہ وقت اگر آ گیا تو امت کو کتنے بڑے خسارے کا سامنا ہوگا؟

مولوی صاحب کی معروضات اور ہماری استدعا پر توجہ نہیں دی گئی اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ بڑی بڑی کمپنیاں کمرشل مقاصد کے تحت اجتماعی قربانی کے اس عمل میں داخل ہو گئی ہیں جس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ مدارس کو کھالیں نہیں ملیں گی اور دوسرا نتیجہ یہ کہ لوگ قربانی کی سنت کے پورے نظام سے لاتعلق ہو کر گھر بیٹھے ہوئے قربانی کے گوشت کا انتظار کریں گے۔ بکرا منڈی کون جائے؟ جانور کون تلاش کرے؟ جانور کی دیکھ بھال کون کرے؟ چارہ کون کھلائے؟ اس کا پیشاب پاخانہ کون صاف کرے؟ اس سے اُنس ومحبت کیوں پیدا کریں؟ سب سے بہترین آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ اس کمپنی کے پاس جائیں، پیسے جمع کرائیں، ٹوکن لیں اور گھر آ جائیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس رویے کے نتیجے میں قربانی کی سنت کی اصلیت، حقیقت، روحانیت باقی رہے گی یا نہیں؟

تین سال کے بعد کراچی کے ایک ممتاز علمی مذہبی رسالے میں مفتی محمد معاذ اشرف صاحب نے قربانی کے کمرشل ازم کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان ہے ''اجتماعی قربانی میں ہونے والی عمومی غلطیوں کا جائزہ'' مضمون میں مولوی احتشام صدیقی صاحب کے تمام خدشات کی تصدیق کی گئی ہے۔

وہ لکھتے ہیں ''اجتماعی قربانی کو بڑے پیمانے پر کمرشل بنیادوں پر انجام دیا جانے لگا ہے اور اس کو مستقل طور پر ایک کاروبار سمجھ لیا گیا ہے۔ پھر بڑے بڑے برانڈز کی اس عمل میں شمولیت نے وہ کچھ مناظر دکھائے ہیں جن کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس تحریر کا مقصد اس خرابی اور اس کے سنگین نتائج سے امت کو آگاہ کرنا ہے۔''

ہمارا سوال یہ ہے کہ جب ہم اور مولوی احتشام صاحب امت کو اسی خطرے سے آگاہ کر رہے تھے تو اس معاملے سے چشم پوشی کی گئی۔ اب معاملہ ہاتھ سے تقریباً نکل رہا ہے تو ہمیں

ازسرنو اپنے رویے اور اپنے اجتماعی اداروں کے قیام پر غور کی ضرورت ہے۔ اگر قربانی کو انفرادی اور نجی اجتماعی سطح پر رکھ کر علماء امت کی رہنمائی فرماتے رہتے تو کسی کمپنی کو کمرشل بنیادوں پر قربانی کے پورے ادارے کو ہتھیا لینے کی جرأت نہ ہوتی؟ مختلف علماء کی آراء ہم نے سرخیوں میں سمودی ہیں۔ مولوی احتشام صاحب کے چند سوالات ہیں وہ ہم بغیر تبصرے کے علماء کی خدمت میں پیش کررہے ہیں مفتیان کرام ان سوالوں کی حقانیت کے بارے میں ہماری رہنمائی فرما سکتے ہیں:

۱۔ قربانی کا حکم قرآن میں صرف فرد کو دیا گیا ہے یا فرد کو یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ وہ اپنی تمام مذہبی ذمہ داری، سنن، نوافل کو بالائے طاق رکھ کر قربانی کا اختیار کسی کمپنی، ادارے، تنظیم، آرگنائزیشن کے سپرد کردے؟

کیا ادارہ ان تمام سنن اور نوافل پر عمل کرسکتا ہے جو قربانی سے متعلق احادیث میں بیان ہوئیں اور تمام امت پندرہ سو سال سے ان پر عمل کررہی ہے؟ امت کا اس عمل پر اجماع، تواتر، تعامل کیا فرد کو اجازت دیتا ہے کہ وہ سنت سے انحراف کرے؟

۲۔ شریعت نے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم فرد کو دیا ہے یا فرد کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ ٹیلی فون کرکے کسی ادارے کے اکاؤنٹ میں براہ راست جمع کرادے؟ قرآن میں صلوٰۃ وزکوٰۃ کا حکم ہر جگہ ساتھ ساتھ آیا ہے بندہ نماز کے ذریعے خالق سے تعلق استوار کرتا ہے اور خالق کے حکم پر زکوٰۃ کے ذریعے اس کی مخلوق سے دائمی رشتہ محبت ومودت قائم کرتا ہے، اس سے رابطے میں رہتا ہے ان کے دکھ درد میں شریک ہوکر ان کے مالی، معاشی، مادی حالات سے باخبر رہتا ہے اور زکوٰۃ سے ان کی مدد کرتا ہے۔

اس کے اعزہ، اقرباء، ہمسائے، غرباء، مساکین، فقرا، احباب، دور کے رشتہ داروں میں سے کئی زکوٰۃ کے حق دار ہیں۔ ایک ادارے کو فون کرکے زکوٰۃ دینے کے نتیجے میں مخلوق سے جو رشتہ منقطع ہورہا ہے اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ کیا قرآن وسنت کے احکامِ زکوٰۃ کا منشاء یہی ہے کہ فرد، زکوٰۃ فرد کو دینے کی بجائے کسی ادارے کے سپرد کردے؟

۳۔ نشوز پر سزا دینے کا اختیار فرد (شوہر) کو دیا گیا ہے یا کسی ادارے یا عدالت کو؟

۴۔ خلع کا اختیار کسی فرد کو دیا گیا ہے یا کسی ادارے کو، عدالت کو، ریاست کو دیا گیا ہے؟

۵۔ طلاق کا اختیار کسی فرد کو دیا گیا ہے یا کسی ادارے کو، عدالت کو، ریاست کو دیا گیا ہے؟

۶۔ چاند دیکھنے کا حکم فرد کو دیا گیا ہے یا ریاست، ادارے کو دیا گیا ہے؟ فرد ارباب حل وعقد کے سامنے شہادت دے گا تا کہ وہ اعلان کریں لیکن رویت کا حکم فرد ہی کو دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی آنکھ سے رمضان المبارک کا چاند دیکھ لے تو اس کے لیے یہی حکم ہے کہ وہ روزہ رکھ لے۔ ریاست، عدالت، قاضی، رویت ہلال کمیٹی کچھ بھی کہے اس فرد پر روزہ رکھنا فرض ہے کیونکہ شریعت کا مخاطب فرد ہے اکثر احکامات فرد ہی کو دیے گئے ہیں۔

۷۔ خانگی معاملات میں اختلافات پر فرد کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ حَکَم کا تقرر کرلیں جو فیصلہ کردے اسے مان لیں۔ یہ عمل فرد اور فرد کے ذریعے انجام پا رہا ہے اس میں ریاست، عدالت، قاضی کوئی مداخلت نہیں کرسکتا۔ وہ تمام اسلامی احکام جن میں شریعت نے فرد کو مخاطب بنایا ہے کیا فرد کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ ان احکام پر خود عمل کرے، نہ کہ اپنے اعمال اداروں کے سپرد کرتا چلا جائے جس کے نتیجے میں Personal structure ختم ہوجائے گا اور Impersonal structure وجود میں آئے گا جیسا کہ مغرب میں ہوا ہے کہ اداروں نے تمام انفرادی ذمہ داریوں کا خاتمہ کر کے اپنا غلبہ فرد پر قائم کردیا ہے۔

۸۔ یتیم کی کفالت کا حکم شریعت نے فرد کو دیا ہے ادارے کو نہیں۔ یتیم کو صرف کھانا اور چھت نہیں چاہیے ماں کی محبت، باپ کی آغوش اور معاشرتی خاندانی زندگی چاہیے جو کسی خاندان میں ہی ممکن ہے۔ کیا اسی وجہ سے اسلامی تاریخ میں یتیم خانے قائم نہیں ہوئے؟ افراد نے اپنی ذمہ داری پوری کی۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج کا فرد اپنی شرعی ذمہ داری ادا کرنے کی بجائے اسے مسلسل اداروں کے سپرد کر رہا ہے۔ احکامِ شریعت فرد کے لیے ہیں یا ادارے کے لیے ہیں؟ ادارہ کمرشل ہوجائے تو اسے کیسے روکا جائے؟

اسلام اور مغرب سید خالد جامعی

عالمِ اسلام میں مغرب جیسی ترقی کیوں ممکن نہیں؟

مشہور مستشرق برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) نے یہ سوال اٹھایا تھا:

Why did scientific break through occur in Europe and not as, one might reasonably have expected, in the richer, more advanced and in most respects more enlightened realm of Islam?

"یورپ میں سائنسی انقلاب کیوں آیا اور اسلام کی مالا مال، ترقی یافتہ اور بیشتر حوالوں سے زیادہ روشن خیال سلطنت میں نہیں آیا جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی؟"

مسلم حلقے اس سوال پر ششدرہ ہو کر شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ دو سو سال میں اس سوال کے سات مختلف جوابات دیئے گئے ہیں:

(۱) مغربی استعمار کا عالم اسلام پر تسلط

(۲) قدامت پرستی جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے

(۳) اسلامی روایات و اقدار سے قطع تعلق

(۴) ناخواندگی

(۵) آبادی میں بے تحاشہ اضافہ

(٦) عورتوں کی قومی زندگی میں عدم شمولیت

(۷) آمریت جو ایجادات کی راہ میں رکاوٹ بن گئی

یہ جوابات دینے والے بھول گئے کہ جب مسلمانوں نے روم اور ایران کی دو عظیم طاقتوں کو شکست دی تب مسلمانوں کے پاس نہ کتب خانے تھے، نہ کارخانے، نہ اسلحہ خانے، نہ خواندگی عام تھی، نہ آبادی زیادہ تھی، نہ سائنسی ترقی تھی، نہ کالج و یونیورسٹی قائم تھے اور نہ عورتیں مردوں

کے ساتھ زندگی کی دوڑ میں شریک تھیں، صرف ایک کتاب سارے عرب میں موجود تھی لیکن مسلمانوں نے صرف کردار اور یقین کی دولت سے دو عظیم طاقتوں کو شکست دے دی۔

جدید اور قدیم سائنس میں فرق

جدید سائنس کی ترقی پر رشک کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ جدید سائنسی ترقی اچانک آناً فاناً نہیں ہوئی۔ اس کی طویل تاریخ ہے جس کا پس منظر جانے بغیر اس ترقی کو فطری ترقی تصور کرنا غیر علمی رویہ ہے۔ جدید سائنس کی اصل حقیقت سے آگہی کے لیے قدیم سائنس اور ازمنہ وسطیٰ کی سائنس سے جدید سائنس کا تقابلی مطالعہ لازمی ہے۔ جدید سائنس کا تعلق سرمایہ داری سے ہے اور سرمایہ داری کو جانے بغیر اس تعلق کی نوعیت کو سمجھنا محال ہے۔ سرمایہ دارانہ نظمِ معیشت اور سرمایہ دارانہ نظمِ سیاست کے بغیر جدید سائنسی ترقی ممکن ہی نہیں۔ سرمایہ داری اور جدید سائنس لازم و ملزوم ہیں۔ جدید سائنس کی مابعد الطبیعیات ارتکازِ سرمایہ، لذت، سہولت، عیش و عشرت اور مادی فتوحات کے ذریعے زمین کو جنت ارضی بنانے کے سوا کچھ نہیں۔ اس کا خدا جبلت اور جمالیات ہے۔ جدید و قدیم سائنس کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوگا کہ دنیا کے قدیم اور وسطی معاشروں میں سائنس کا مقام کیا تھا اور اس کا کیا کردار تھا؟ سائنس ان ادوار میں معاشروں کے خادم کا کردار ادا کرتی تھی یا اسے معاشروں پر حاکمانہ تسلط حاصل تھا؟ سائنس اس عہد کی علمیات اور الٰہیات سے برآمد ہوئی تھی یا اس عہد کی علمیات اور الٰہیات سائنس کے غلام تھے؟

ان مباحث سے صَرف نظر کر کے جدید سائنس کو فطری، حقیقی سمجھنا محض مفروضات پر یقین رکھنا اور سائنس کے ارتقاء کی تاریخ سے کامل عدم آگہی کا شاخسانہ ہے۔ یہ موقف رکھنے والے جدید سائنس کے فلسفۂ مابعد الطبیعیات، اس کے تصورِ کائنات و تصورِ انسان، اس کے مقاصد اور اہداف سے کلی طور پر ناواقف ہیں۔ جدید سائنس جدید فلسفۂ مغرب کے بطن سے برآمد ہوئی ہے اور فلسفۂ مغرب کی بنیاد سرمایہ داری، نوآبادیات، استعماریت، دہشت گردی اور عیسائیت کی شکست و ریخت تاریخ کے عمیق مطالعے کے بغیر تلاش کرنا محال ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک سائنس نیچرل فلاسفی کہلاتی تھی لیکن انیسویں صدی کے اختتام پر اسے فلسفہ سے الگ کر دیا گیا اور سائنس خود ایک ذریعۂ علم بن گئی۔ سائنس اور فلسفے میں جب تک ہم

آہنگی تھی چیزوں کی حقیقت اور قدر کا سوال برقرار رہتا تھا۔ مثلاً یہ سوال موجود رہتا تھا کہ مَیں پانی کیوں پیوں؟ لیکن سائنس جب فلسفے سے الگ ہوئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سوال بے کار تھا کہ پانی پیا جائے یا نہیں؟ اس سوال کی ضرورت ہی نہ رہی، اصل سوال یہ ہے کہ اچھے طریقے سے پانی کس طرح پیا جائے؟ دلیل (Reason) اور (Rational) عقلیت جب آلاتی (Instrumental) ہو گئے تو سائنس فلسفہ سے الگ ہو گئی۔ جدید سائنس کا بانی نیوٹن ایک مذہبی شخص اور فلسفی تھا۔ اس نے بھی سائنس کو فلسفے سے الگ نہیں سمجھا۔ اس کی کتاب کا نام *Mathematical Principle of Natural Philosophy* تھا۔ نیوٹن نے نصف زندگی مذہبی کتابیں لکھیں، وہ خدا کے وجود کا دل سے قائل تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ خدا کائنات بنا کر اس سے الگ تھلگ ہو گیا ہے۔

اس تصور نے ایک بے خدا سائنس تیار کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ڈیکارٹ نے بھی ذہن سے خدا کو ثابت کیا۔ کانٹ نہایت مذہبی شخص تھا لیکن ڈیکارٹ، نیوٹن اور کانٹ (جو خدا کے قائل تھے) ان کے پیش کردہ فلسفہ کے نتیجے میں خدا کا وجود مغربی تہذیب و تاریخ سے خارج کر دیا گیا۔ یہی کام اسلامی جدیدیت پسند عالم اسلام میں کر رہے ہیں۔ وہ بہت نیک اور راسخ العقیدہ ہیں لیکن ان کی غلط فکر کے نتیجے میں اسلام کو مستقبل میں یہی خطرات درپیش ہوں گے۔ قدیم سائنس میں خدا کا تصور اور خدا کا کردار موجود تھا کیونکہ وہاں انسان مخلوق تھا، خالق نہ تھا۔ اپنے مخلوق ہونے کا احساس اسے خدا اور آخرت کے تصورات سے وابستہ رکھتا تھا، لیکن Newtonian تصورِ کائنات کے بعد کائنات ایک Subject ہے اور انسان محض Object۔ اس کے نتیجے میں مادی تصورِ کائنات وقوع پذیر ہوا جس نے خالق کائنات کی جگہ لے کر انسان کو خالق قرار دے دیا۔ نیوٹن کے افکار سے استفادہ کے لیے ہمیں بیکن، لاک، ڈیکارٹ اور گیلی لیو کے فلسفے و افکار کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ بیکن نے Induction کے طریقے کو متعارف کر کے جزو کی بنیاد پر کلیات قائم کرنے کا سائنسی طریقہ بتایا، جس نے بے شمار مسائل پیدا کیے۔ یہ طریقہ آخر کار خود ایک مسئلہ بن گیا اور اپنے دعوے کو ثابت نہ کر سکا تو مسئلے کے حل کیلئے پاپر کا شہرہ آفاق طریقہ Falsification ایجاد ہوا جس کے تحت سائنس کی ترقی اور ارتقاء صرف اس عمل سے مشروط ہے کہ اس کے کتنے اصول ٹوٹے، پامال ہوئے،

غلط قرار دیئے گئے؟ جب تک پہلا نظریہ ثابت نہیں ہوجاتا وہی نظریہ درست قرار پائے گا اور جیسے ہی یہ نظریہ غلط قرار پائے گا نیا نظریہ اس کی جگہ لے لے گا، اسی لیے بعض زعماء کی رائے ہے کہ سائنس علم نہیں ''محض کام چلانے کا طریقہ ہے''۔ زندگی کے کارواں کو یہ چالو رکھنے کا کام کرتا ہے۔ کب تک؟ کچھ نہیں کہا جاسکتا، کام چل رہا ہے لہٰذا کام چلاتے رہو۔

ڈیکارٹ نے Dualism کا نظریہ دیا جس کے نتیجے میں ایک نیا انسان پیدا ہوا جس کے فکر ونظر کے پیمانے قدیم انسان سے قطعاً مختلف تھے۔ اسی لیے فوکو نے کہا تھا کہ انسان تو اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوا ہے۔ یہ خلقِ جدید کائنات اور انسان کے بارے میں ایک عجیب نقطہ نظر لے کر اٹھی جس نے آخرکار فلسفے، سائنس، کائنات اور انسانوں کی زندگی سے خدا کو خارج کردیا۔ ڈیکارٹ، بیکن اور لاک نے نیوٹن پر اثر ڈالا اور نیوٹن نے مغرب کے سب سے بڑے فلسفی کانٹ پر اثر ڈالا۔ کانٹ نے اپنے علم کی بنیاد پر یہ فیصلہ دے دیا کہ علم، عقل اور تجربے کے بغیر وجود نہیں رکھتا لہٰذا مابعد الطبیعیاتی سوالات پر غور وفکر ممکن ہی نہیں ہے لہٰذا انسان حقیقت، اصلیت نہیں جان سکتا۔ ہر شخص قائم بالذات ہے، خود مختار ہے، عقلیت کا حامل ہے، خود قانون بنا سکتا ہے اور اگر وہ ان خصوصیات کا حامل نہیں تو وہ انسان ہی نہیں ہے، Cartaginian Newtonian world view نے سائنس کے سوچنے، سمجھنے اور برتنے کے تمام پیمانے بدل ڈالے اور کائنات پر غور وفکر کے تمام قدیم اسالیب تہس نہس کر دیئے لہٰذا اس پورے عمل کا مطالعہ کئے بغیر سائنس کی ہلاکت آفرینی سمجھی نہیں جاسکتی۔ اس بات پر بھی غور وفکر کی ضرورت ہے کہ کیا سائنس پہلے وجود میں آئی یا ٹیکنالوجی پہلے وجود میں آئی؟ انسان جب سے اس کائنات میں موجود ہے اپنی ضروریات کے مطابق آلات اور اوزار تیار کرتا رہا ہے لہٰذا ٹیکنالوجی تو قدیم زمانے سے موجود ہے۔ اس ٹیکنالوجی کی علمی تفہیم کے لئے سائنس وجود میں آئی۔ مثلاً جرمنی میں کپڑا رنگنے کے بہت سے طریقے مستعمل تھے، اس تکنیک سے کیمیا کی سائنس وجود میں آئی۔

ٹیکنو سائنس تکاثر کا دوسرا نام اور شہوت وغضب کی عالمگیریت کا اعلامیہ ہے

سترہویں صدی سے پہلے ٹیکنالوجی سائنس کی مددگار تھی لیکن سترہویں صدی کے بعد

سائنس ٹیکنالوجی کی مددگار بن گئی ہے بلکہ معاملات اب اس قدر آگے چلے گئے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اصطلاحات مدغم ہوکر ایک نئی اصطلاح کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں جسے ہم عہد جدید میں ٹیکنو سائنس (Techno-Science) کہتے ہیں۔ اس اصطلاح کے مفاہیم کی ایک الگ دنیا ہے۔ اس وقت سائنس و ٹیکنالوجی کے بیشتر دھارے فزیکل، ٹیکنالوجی، میڈیکل ٹیکنالوجی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی تک محدود ہوگئے ہیں۔ سترہویں صدی سے پہلے تمام مذہبی معاشروں میں سائنس وٹیکنالوجی لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے خادم کے طور پر کام کرتے تھے، بیسویں صدی میں ٹیکنو سائنس انسانوں کی ضروریات نہیں خواہشات پوری کرنے کا فریضہ انجام دے رہی ہے، یہ خواہشات بھی فطری خواہشات نہیں بلکہ غیر فطری خواہشات ہیں جن کی تخلیق مصنوعی طریقے سے کی گئی ہے، جنہیں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ذریعے فطری خواہشات کا درجہ دے دیا گیا اور ہر انسان ان غیر فطری خواہشات کی تکمیل کے لیے بے خود ہوگیا ہے۔

ٹیکنو سائنس تکاثر کا دوسرا نام ہے، یہ شہوت وغضب کی عالمگیریت کا اعلامیہ ہے۔ یہ غیر فطری خواہشات کو تخلیق کر کے انھیں بھڑکا کر آگ لگا کر حلقۂ خریداری مہیا کرتی ہے۔ ٹیکنو سائنس انسانیت کی نہیں حیوانیت، جاہلیت، شہوت غضب، نفس پرستی یا مختصر لفظوں میں سرمایہ داری کی حاشیہ بردار اور خادم ہے۔ یہ سرمایے سے نکلی اور سرمایے سے چلی ہے۔ اس کا وجود صرف اور صرف سرمایہ کا مرہون منت ہے لہٰذا یہ سرمایہ پیدا کرتی ہے اور سرمایہ میں مسلسل اضافے کا نام ہے۔ ٹیکنو سائنس کے ذریعے غیر فطری خواہشات کی تکمیل کے نتیجے میں جو مسائل، بیماریاں، آلام، مصیبتیں، عوارض، نفسیاتی مسائل، ذہنی وقلبی، جنسی و جسمانی امراض پیدا ہوتے ہیں ان کے علاج کے لیے ٹیکنو سائنس عظیم طبی ایجادات کرتی ہے یعنی پہلے مسائل پیدا کرتی ہے پھر مسئلے کو حل کرتی ہے اور اس غیر فطری عمل کو عظیم الشان سائنسی وطبی انقلاب کا نام دیتی ہے۔ ٹیکنو سائنس کا پہلا اور آخری وظیفہ سرمایہ کی بڑھوتری ہے اور سرمایہ کی بڑھوتری میں خدا کی رضا تلاش کرنا مغربی تہذیب، سائنس اور مغربی ٹیکنالوجی یا مختصراً ٹیکنو سائنس میں ممکن ہی نہیں رہا لہٰذا مغرب میں ہر چیز سرمایہ دارانہ معیشت، سرمایہ دارانہ معاشرت اور سرمایہ دارانہ تنظیم میں ڈھل گئی ہے۔ جدید سائنس یا ٹیکنو سائنس جو بھی اہداف متعین کرتی ہے ان کا

حصول سرمایہ کے بغیر ممکن نہیں ہے لہٰذا دولت ہی اصل نیکی قرار پائی (Wealth is Virtue) کیونکہ دولت کے بغیر ایجاد ممکن نہیں، ایجاد کے بغیر ترقی اور کمال ممکن نہیں، اس کے بغیر لذت کا حصول ناممکن ہے، ترقی کمالِ لذت کے بغیر دنیا کا وجود اس کارخانہ ہست و بود کی ضرورت رائیگاں ہے، زندگی کے تمام رنگ پھیکے ہیں۔ یہ زندگی فی الحقیقت قفس اور قید خانہ ہے لہٰذا ان آلام سے چھٹکارے کے لیے دولت کا حصول اصل مقصدِ زندگی ہے لہٰذا۔

کیسا خدا؟ کیسا نبی؟ پیسہ خدا، پیسہ نبی!

مِل اور بینتھم کے نظریات نے لذت اور لطف اندوزی کی ایک خاص ذہنیت پیدا کی جو سترہویں صدی سے قبل دنیا کے تمام معاشروں میں مفقود تھی۔ زندگی کا مقصد افادیت و لذت پرستی سے جوڑ دیا گیا یہی حاصلِ زندگی بن گئی۔ اس ہدف کی تکمیل یعنی لذت تعیّشات معیار زندگی میں اضافہ اور خواہشات کی سرعت سے تکمیل کے اہداف سائنس و ٹیکنالوجی نے برق رفتاری سے طے کیے، آج سائنس کی جس قدر بھی ترقیات ہیں وہ اسی نقطہ نظر کی ترویج، توسیع، اشاعت تک محدود ہیں کیونکہ سرمایہ دارانہ حرص وحسد کے نتیجے میں انہی دائروں میں غیر معمولی ترقی ممکن ہے۔ مغرب کے بڑے بڑے فلسفی سائنس کو Value Neutral نہیں مانتے وہ اسے Value Specific قرار دیتے ہیں۔ King of the Philosophers ہائیڈیگر کی کتاب *Question Concerning Technology* اس سلسلے میں بہت سے حقائق واضح کرتی ہے۔ مغرب کے فلسفیوں نے فلسفے سے خدا، مذہب، آخرت اور تمام مابعد الطبیعیاتی سوالات کو خارج کر دیا۔ کسی بڑے جدید مغربی فلسفے کے نظامِ فکر میں موت کے سوال پر غور وفکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہائیڈیگر جیسا عظیم فلسفی بھی یہ کہتا ہے کہ ہم کہاں سے آئے ہم کہاں جائیں گے؟ یہ لایعنی سوالات ہیں، اصل مسئلہ میرے وجود کا ہے، اصل مسئلہ ذات کے اظہار کا اور روزانہ کی زندگی (Everyday life) کا ہے۔

فلسفہ نے جب خدا سے اور حقیقتِ مطلق سے دامن چھڑا لیا تو سائنسدانوں نے بھی سائنس سے خدا کو خارج کر دیا لیکن ہمارے مسلم جدیدیت پسندوں کا مسئلہ یہ ہے کہ کسی طرح سے سرمایہ داری، سرمایہ دارانہ نظام، سائنس، ٹیکنو سائنس میں خدا کو داخل کر دیا جائے تاکہ اس کافرانہ نظام کی اسلام کاری ہو سکے۔ وہ جدید سائنس کے فلسفیانہ مباحث سے ناواقف ہیں۔

انہیں معلوم ہی نہیں کہ جدید سائنس میں روایت، مذہب، روحانی تجربات اور مابعدالطبیعیاتی سوالات کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، یہ اس کا موضوع اور دائرہ کار نہیں ہے۔ ننانوے فیصد جدیدیت پسند اور راسخ العقیدہ مسلم مفکرین سائنسی طریقہ کار سے ناواقف ہیں لہٰذا وہ سائنس سے اسلام کو ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ قدیم سائنس کا وجود حقیقت کے تصور سے نکلتا تھا، وہ جو حقیقتِ ازلی اور حقیقتِ مطلقہ ہے جسے ذات باری تعالیٰ کہتے ہیں۔ اس کے برعکس جدید سائنس کا تصورِ حقیقتِ مطلقہ خدا سے انکار پر مبنی ہے۔ اگر جدید سائنس کی مابعدالطبیعیات نکال کر اس میں اسلام کی مابعدالطبیعیات شامل کردی جائے تو کیا جدید سائنس کو مشرف بہ اسلام کیا جاسکتا ہے؟ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے، وہ سائنس جو اسلامی تاریخ، تہذیب، الٰہیات اور مابعدالطبیعیات سے نکلے گی وہی معتبر، بہتر اور موثر ہوگی۔

یہ عجیب بات ہے کہ قرآن مادی ترقی، تمام سائنسی علوم، تسخیرِ کائنات کے نظریات لے کر آیا تھا لیکن اس پر عمل کی سعادت کفار کو حاصل ہوئی؟ جدیدیت پسندوں کا یہ نظریہ مغرب اور انبیائے کرام علیہم السلام کی تاریخ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ نیوٹن نے حقیقتِ مطلقہ کو جاننے کی کوشش کی تھی لیکن آئن اسٹائن کے بعد مغرب میں کوئی ایسا سائنسداں پیدا نہیں ہوا جو سائنس کو حقیقتِ مطلقہ کے سمجھنے کا ذریعہ سمجھتا ہو۔ کوانٹم مکینکس کی ترقی نے حقیقت مطلقہ کے سوال کو بے معنی کردیا ہے، مغرب میں اب صرف سائنسدان پیدا ہورہے ہیں۔ پہلے یہ فلسفی بھی ہوتے تھے۔ انہیں چیزوں کی حقیقت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے صرف اس کے فائدے سے دلچسپی ہے اور یہ کہ اس ایجاد سے سرمایہ میں کتنا اضافہ ہوگا لہٰذا اقدار اور حقیقت کے سوال لایعنی ہوگئے۔ جب مابعدالطبیعیات ختم ہوگئی تو اخلاقیات کے اصول کہاں سے اخذ کیے جاتے؟ لہٰذا مغرب سے اخلاقیات کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ مصنوعی اخلاقیات کے اصول بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ان کی بنیاد بھی فائدے اور لذت پر ہے۔ جدید سائنس مادیت کو اصل مقصود قرار دے کر اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ مابعدالطبیعیاتی سوالات کا جواب دریافت کرلے گی اور آثارِ کائنات کے مشاہدات کے ذریعے خالق کائنات کو جان لے گی لیکن جوں جوں اس کا سفر آگے بڑھتا گیا اس نے اپنی تہی دامنی کا اعتراف کرلیا کہ مابعدالطبیعیاتی سوالات کا جواب

اس کے دائرے سے باہر ہے۔اس عجز کے باوجود اس نے خدا اور آخرت کا انکار کر دیا۔

نیوٹن نے جس مادیت کی بنیاد پر جدید سائنس کو فروغ دیا تھا اس کا منطقی اور فطری نتیجہ یہی تھا، مغربی فلسفے نے جدید سائنس کو مادیت کے فروغ کے لیے آلۂ کار بنایا لہٰذا اس نے پوری دنیا کو مادیت کا غلام بنا دیا۔ چنانچہ مغرب کی تین سو سالہ تاریخ میں کوئی ایک سائنس دان نہیں پیدا ہوا جو ولی اللہ بن گیا ہو جبکہ اللہ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم والے ہوں۔ یہ کیسا علم ہے جو معرفت رب عطا نہیں کرتا؟ آثار کائنات کے عمیق مشاہدے کے باوجود اللہ کی قربت سے فیض یاب نہیں ہونے دیتا؟ وجہ یہ ہے کہ سائنسدان مادیت کی تلاش میں محو سفر ہوتا ہے وہ خود کو خالق سمجھتا ہے لہٰذا تخلیق کے اس نام نہاد عمل میں اس کی اصل منزل اوجھل ہو جاتی ہے اور وہ آثارِ کائنات سے خدا کی قربت حاصل کرنے کی بجائے خدا کے انکار کی جرأت حاصل کرتا ہے۔(جاری ہے)

بقیہ: تربیت ضروری ہے یا تعلیم؟

ہم جانتے ہیں ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کام خود کرنا پسند فرماتے تھے بلکہ خود کیا کرتے تھے۔ایک غزوہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکڑیوں کا گٹھا اٹھایا تو ایک صحابی نے آگے بڑھ کر عرض کیا ''حضور میں اٹھاتا ہوں مجھے دیں''۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا نہیں مجھے اٹھانے دو کیا قیامت میں میرا بوجھ تم اٹھاؤ گے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس طرز عمل میں ہمارے لیے نمونہ ہے مگر ہم اس پر عمل نہیں کرتے۔آج مائیں بچوں کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے کھانا کھلاتی ہیں۔ان کے ناز نخرے اٹھاتی ہیں۔مانا کہ یہ شیر خوارگی میں تو ٹھیک تھا مگر جب بچہ 3،4 سال کا ہو جائے تو اس کی تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ اپنے کام خود کرنے کا بتدریج عادی ہو جائے۔ عادتیں ہی تکمیل ذات کا سبب بنتی ہیں۔تربیت ایک مکمل نظام ہے جو طے شدہ منصوبہ سازی کے ذریعے افراد سازی کا ذریعہ ہوگا۔تعلیم سے زیادہ ہمیں تربیت کی ضرورت ہے۔

تفہیم مغرب

بلال احمد

مغربی تہذیب کے پیدا کردہ مسائل کا حل اسلام میں کیوں؟

ہر تہذیب پر عملدر آمد کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہوتے ہیں اس کا حل بھی اسی تہذیب سے کیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ مسئلہ ایک تہذیب پیدا کرے اور اس کا حل دوسری تہذیب سے کیا جائے۔ مثال کے طور:

* مغربی طرز طعام کے نتیجے میں جو جدید بیماریاں پیدا ہوئیں ان کا علاج کلونجی کے پانچ یا سات دانوں سے ممکن سمجھنا۔

* مغربی طرز معیشت سے پیدا شدہ مسائل کو اسلام سے حل کرنا۔ اسلامی بینکنگ، اسلامی انشورنس، مارکیٹ، سروس سیکٹر وغیرہ۔

* مغربی طرزِ تعلیم کے نتیجے میں خود غرض، حریص و حاسد اخلاق کی حامل شخصیت کا علاج چند ’’اصلاحی مجالس‘‘ سے ممکن سمجھنا۔

* اسی طرح مغربی اقدار پر مبنی معاشرتی مسائل کا حل اسلامی معاشرتی نظام سے ممکن سمجھنا سوائے کج فہمی کے اور کچھ نہیں۔

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی، اُسی کا مشتاق ہے زمانہ

جہانِ نَو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالَمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قِمار خانہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

اقبالؔ

عالم اسلام

پروفیسر ڈاکٹر شمس الحق حنیف[۱]

مسئلہ فلسطین۔تاریخی پس منظر اور حقائق

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۱﴾﴾

[الاسراء ۱:۱۷]

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: بُعِثْتُ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ بِالسَّيْفِ حَتَّى يُعْبَدَ اللّٰهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، وَجُعِلَ رِزْقِي تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِي، وَجُعِلَ الذِّلَّةُ وَالصَّغَارُ عَلَى مَنْ خَالَفَ أَمْرِي، وَمَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ."[۲] وفی رواية :" بعثت بالسيف[۳]" وقال ﷺ:"أنا نبی الرحمة وأنا نبی الملحمة"[۴]

غزہ اور فلسطین کا موضوع آج کا سلگتا ہوا مسئلہ ہے۔

مجھے ایسے لوگوں پر افسوس ہوتا ہے جو بظاہر نہایت سمجھ دار اور عالم وفاضل نظر آتے ہیں لیکن اس اہم مسئلے کی نوعیت تک سے بالکل نا آشنا ہیں۔کئی ہفتے ہو گئے ہیں کہ پوری دنیا بلکہ غیر مسلم ممالک میں بھی مسئلہ فلسطین ایک سلگتا موضوع (Burning issue) بن گیا ہے اور ہر جگہ یہی مسئلہ ڈسکس ہو رہا ہے جبکہ دوسری طرف ایک مسلمان کے دل میں سرے سے کوئی تڑپ ہی پیدا نہیں ہو رہی کہ کم از کم اس مسئلے کو سمجھنے کی کوشش ہی کرے۔مسلمانوں کی اس قسم کی بے حسی اور غفلت بڑا عیب اور تعجب خیز ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

بہر حال اس مسئلے کے چار پہلو ہیں۔آج مَیں ان چاروں پہلوؤں کو زیرِ بحث لانا چاہتا

---

[۱] پشاوری میڈیکل کالج، پشاور۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی ایک تقریر ہے جسے مضمون کی شکل دی گئی ہے۔

[۲] مسند احمد بن حنبل، مسند عبداللہ بن عمر بن الخطاب ؓ، رقم الحدیث: ۵۱۱۵

[۳] ایضاً: رقم الحدیث: ۵۱۱۴

[۴] المعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث: ۱۵۷۳

ہوں، اِس کے بعد میرا آپ سے یہی مطالبہ ہوگا کہ آپ اس سبق کو اچھی طرح یاد کرلیں، اور پھر اس سبق کے داعی بن کر اُٹھیں۔

مسجد اقصیٰ کی مختصر تاریخ

مسجد اقصیٰ کا ذکر قرآن مجید میں جا بجا آیا ہے، اس کے لیے ایک لفظ قرآن نے ﴿بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ﴾ کا استعمال کیا ہے یعنی اس مسجد کے اطراف واکناف میں اللہ تعالیٰ نے خیر وبرکت رکھ دی ہے۔ اسی برکت کی بات قرآن مجید کے دیگر مقامات پر بھی دہرائی گئی ہے۔

مسجد اقصیٰ کو مسجد کہنے پر بھی کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اُس وقت تو وہاں سرے سے کوئی مسجد ہی نہیں تھی، مسجد تو وہاں بعد کے دور میں بنادی گئی۔ درایں صورتحال قرآن نے اسے مسجد کیونکر کہا؟ اس اعتراض کا الزامی جواب یہ ہے کہ پھر بیت اللہ کو مسجد کیوں کہا؟ ﴿مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَى﴾ حالانکہ اس وقت صرف بیت اللہ موجود تھا، جس سے مراد خانہ کعبہ کی عمارت تھی، اس کے اردگرد مسجد تو بعد میں بن گئی۔ لہٰذا سمجھنے کی اصل بات یہ ہے کہ جب قرآن مجید نے ایک دفعہ کسی مقام کو 'مسجد' قرار دے دیا تو وہ تا قیامت مسجد کی حیثیت سے برقرار رہے گا، مسجد محض دیواروں اور ستونوں کا نام نہیں ہے، عمارتوں میں تغیرات آتے رہتے ہیں، اگر دیکھا جائے تو مسجد نبویؐ کی عمارت بھی بار بار تبدیل ہوتی رہی ہے۔ مسجد کا حکم یہ ہے کہ جب وہ ایک دفعہ مسجد بن گئی تو زمین سے آسمان تک وہ مسجد ہی رہے گی۔ نیز نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں بھی مسجد اقصیٰ کو مسجد ہی قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ زیادہ اجر وثواب کے لیے تین مسجدوں کے علاوہ کہیں اور سفر کرنا حرام ہے۔ "لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ" [۱] تین مساجد کے علاوہ دنیا کی کسی بھی مسجد کو زیادہ ثواب ملنے کی خاطر رختِ سفر مت باندھو اس لیے کہ ہر مسجد میں نماز پڑھنے کا ایک جیسا ثواب ملتا ہے، خواہ وہ مساجد دُور ہوں یا نزدیک، خواہ وہاں نمازیوں کی تعداد زیادہ ہوں یا کم، ہاں ان تین مسجدوں میں ثواب زیادہ ملتا ہے ایک مسجد نبوی، دوسری مسجد الحرام اور تیسری مسجد الاقصیٰ، اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اس پر لفظ 'مسجد' کا اطلاق فرمایا ہے حالانکہ وہاں مسجد بعد میں بنی ہے۔

سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ وہ کب سے مسجد ہے؟ اس کا جواب صحیح بخاری کی ایک حدیث

---

[۱] سنن ترمذی، رقم الحدیث: ۳۲۶

میں موجود ہے کہ آپ ﷺ سے کسی نے پوچھا: پہلی مسجد کون سی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مسجد الحرام۔ پھر آپ سے پوچھا گیا کہ اس کے بعد کون سی مسجد ہے؟ فرمایا مسجد اقصیٰ۔ پوچھا کہ ان دونوں کے درمیان کتنا فرق تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ چالیس سال کا۔ بس یہی صحیح ترین بات ہے۔ دنیا میں سب سے پہلی مسجد بیت اللہ تعمیر ہوئی ہے۔ اس کے بعد دوسری مسجد اقصیٰ تعمیر ہوئی ہے، اور ان دونوں مسجدوں کے درمیان چالیس سال کی مدّت ہے۔

رہا یہ سوال کہ مسجد الحرام کی تعمیر سب سے پہلے کس نے کی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے پہل تو آدم علیہ السلام نے تعمیر کی، پھر نوح علیہ السلام نے، پھر ابراہیم علیہ السلام نے اس کی تعمیرِ نو فرمائی۔ قرآن مجید کی آیات میں غور کرنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر ہو چکی تھی، اور ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی پرانی بنیادوں پر نئی تعمیر کھڑی کر دی۔ کثیر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے بیت اللہ اور بعد میں مسجد اقصیٰ کی تعمیر فرمائی۔ بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر نوح علیہ السلام نے کی تھی، ان روایات میں مسجد اقصیٰ کی تعمیر کا کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے، اور تیسری قسم کی روایات یہ ہیں کہ بیت اللہ کی پہلی تعمیر ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی، اور بعد میں انہوں نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر بھی فرمائی، البتہ مسجد اقصیٰ کی جو بڑی عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی اور پھر عالمی سطح پر اس کی تشہیر ہوئی، وہ دراصل سلیمان علیہ السلام کا کارنامہ ہے اور اسی عظیم الشان عمارت کو یہودی 'ہیکلِ سلیمانی' کہتے ہیں۔ ہیکل دراصل ایک بڑی تعمیر یا بڑی عمارت کو کہتے ہیں جو نہایت وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی اور دور سے نظر آتی ہو۔ چنانچہ سلیمان علیہ السلام نے ایسی عالیشان مسجد بنائی تھی جس کے مینار، گنبدیں اور دیواریں دُور سے ہی نظر آتی تھیں، یہ سارا کام سلیمان علیہ السلام کے دور میں مکمل ہوا تھا۔

مسجد اقصیٰ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی خیر و برکات سے نوازا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد اس مسجد کی بڑی اہمیت رہی، اسی اہمیت کو نبی ﷺ نے بھی برقرار رکھا، نبی کریم ﷺ جب تک مکہ معظّمہ میں تشریف فرما رہے تو نماز پڑھتے ہوئے بیت اللہ شریف میں ایسے مقام پر کھڑے ہوتے جہاں سے بیت اللہ کے ساتھ ساتھ مسجد اقصیٰ بھی سامنے رہے۔ یہ بات میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ کسی صاحب نے اعتراض کیا ہے کہ مسجدِ اقصیٰ کو قبلہ اوّل نہ کہا کرو، (یہ بھی کہا ہے کہ

قبلہ اولیٰ کہنا چاہئے کیونکہ عربی قواعد کے لحاظ سے قبلہ اوّل کہنا غلط ہے حالانکہ قبلہ اوّل کا لفظ لوگ اردو یا پشتو میں کہتے ہیں نہ کہ عربی میں گفتگو کرتے ہوئے، پاکستان میں لوگ عربی میں گفتگو نہیں کرتے۔) کیونکہ قبلہ اوّل تو مکہ معظّمہ ہے؟ روایات مختلف ہیں، قبل از ہجرت مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی ایسی نماز ثابت نہیں ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کعبے کے ساتھ ساتھ مسجد اقصیٰ کی جانب بھی رُخ نہ کیا ہو بلکہ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں کو ایک سمت میں رکھ کر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ ہاں صرف ایک ہی قبلے 'بیت المقدس' کی طرف رخ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں 16 یا 17 مہینے تک نمازیں پڑھی ہیں، پھر بعد میں بیت اللہ شریف کی جانب منہ موڑنے کا حکم آ گیا، چنانچہ اسی وجہ سے بیت المقدس کو قبلہ اول کہا جاتا ہے، ورنہ بیت المقدس کی بہت بڑی اہمیت اس سے قبل بھی تھی۔ بہت سے انبیائے کرام علیہم السلام جیسے ابراہیم ویعقوب، زکریا ویحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے واقعات کا تعلق اسی بیت المقدس کے ساتھ رہا ہے۔ ﴿فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ﴾ [مریم۱۹:۱۱] اس آیت میں جس محراب کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد اسی بیت المقدس کا محراب (بالاخانہ) ہے۔

ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ سنہرا گنبد یعنی قبۃ الصخرہ بیت القدس نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سنہرا گنبد بیت المقدس کا ہی ایک حصہ ہے، یہ بیت المقدس کے اندر واقع ہے اور اس سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اسے عام طور پر قُبۃ الصّخرۃ کہا جاتا ہے۔ اس گنبد کے نیچے ایک بڑی چٹان ہے، جس میں اتنا بڑا غار بنا ہوا ہے جس میں تقریباً 60 افراد سما سکتے ہیں۔ اسی غار اور چٹان کے اوپر یہ گنبد بنایا گیا ہے۔ اس گنبد کی تعمیر کی اپنی ایک تاریخ ہے، جس کی تفصیلات فی الحال مَیں بیان نہیں کرنا چاہتا ورنہ زیر بحث موضوع تشنہ رہ جائے گا۔

قبۃ الصخرہ کے عقب میں مسجد اقصیٰ کی بڑی وسیع عمارت موجود ہے۔ یہاں ہمارے سامنے مختلف الفاظ آتے ہیں جیسے بیت المقدس، مسجد اقصیٰ، قبۃ الصخرۃ اور فلسطین۔ فلسطین دراصل پورے ملک کا نام ہے، قبۃ الصخرۃ سنہرے گنبد کا نام ہے، اور مسجد اقصیٰ دراصل اس عبادت گاہ کا نام ہے جو قبۃ الصخرۃ کے عقب میں واقع ہے جبکہ بیت المقدس اس پورے شہر کا نام ہے جس میں مرکزی حیثیت مسجد اقصیٰ کو حاصل ہے۔

قرآن وحدیث میں اس پورے علاقے کی بڑی اہمیت بیان ہوئی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے

یہاں باقاعدہ اعتکاف کا اہتمام کیا ہے۔ بعض روایات کی رُو سے اس مسجد میں ایک نماز کا ثواب عام مساجد میں پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے جبکہ بعض دوسری روایات میں اس سے کم نمازوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ بہر حال اتنی بات ثابت ہے کہ یہاں نماز پڑھنے کا ثواب بہ نسبت عام مسجدوں میں نماز پڑھنے کے زیادہ ہے۔

تلاوت کردہ آیات میں سے پہلی آیت میں یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کے ایک حصے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر کرایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سفر براق پر سوار ہو کر کیا۔ وہاں سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک دوسرا سفر شروع ہوا جس کو 'معراج' کہتے ہیں، اس سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمانوں کی طرف تشریف لے گئے تھے۔ بیت المقدس میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام انبیاءؑ کی امامت فرمائی۔ مسجد حرام سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسجد اقصیٰ کا سفر کرانے میں اللہ تعالیٰ کی بعض حکمتیں پوشیدہ تھیں جن میں سے ایک حکمت تو بالکل واضح تھی، وہ یہ تھی کہ لوگوں کی پیشوائی اور امامت کے عظیم منصب سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو معزول فرما کر امتِ محمدیہ کو اس منصب پر سرفراز فرمایا۔ بنی اسرائیل کو یہ منصب دیا گیا تھا، بڑے عرصے تک ان میں انبیائے کرامؑ کی آمد کا سلسلہ جاری رہا، لیکن جب وہ اس امامت کے اہل نہ رہے تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہاں کا سفر کرایا اور انہیں امام الانبیاء بنا دیا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ امامت مل گئی، نہ صرف عوام کی بلکہ انبیاء کرامؑ کی امامت بھی عطاء کر دی گئی اور وہ بھی بیت المقدس میں لے جا کر، جو کہ دوسری حکمت یا دوسرا نکتہ ہے۔ اس کا معنی یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں اور اس آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری معرکہ اور نبوت کے آخری ثبوت کی بنیاد بھی بیت المقدس ہی ہوگا اور بیت المقدس ہی میں بالخصوص ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے جن سے صاف پتہ چلے گا کہ ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ﴾ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا وہ صحیح اور برحق تھا اور وہ دور اب یہی ہمارا دور ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

تشریح احادیث

ایک حدیث ہے، جسے امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو سمجھنا ضروری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ 'جعل رزقي تحت ظل رُمحي' میرا رزق اللہ تعالیٰ نے میرے

نیزے کے سائے تلے رکھا ہے، ’وجعل الصغار والذلة علی من خالف امری‘ اللہ تعالیٰ نے میرے حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کے لیے ذلت اور چھوٹا پَن مقدر کر دیا ہے۔اس کا معنی یہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہادی پیغمبر ہیں۔ایک دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد یوں ہے کہ ’انا الماحی‘ میں انقلابی پیغمبر ہوں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پانچ اسمائے گرامی بیان کئے ہیں۔مسند احمد بن حنبلؒ کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا’انا نبی الرحمة‘، ایک دوسری روایت میں ’انا نبی التوبة‘ اور ’انا نبی الملحمة‘ کے الفاظ بھی آئے ہیں یعنی میں رحمت والا نبی بھی ہوں، توبہ والا پیغمبر بھی ہوں (یعنی جو شخص توبہ کرنا چاہتا ہے اسے میرے راستے پر آنا پڑے گا تب ہی اس کی توبہ قبول ہوگی۔) اور میں جنگجو نبی ہوں۔ یعنی مجھے اگر کوئی پیغمبر مانتا ہے اور میرا امتی بننا چاہتا ہے تو اسے جنگ اور جہاد کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔اگر جہاد کے لیے تیار نہیں ہے تو پھر میرا امتی کیسے ہوا؟

اگلی حدیث میں یہ فرمایا کہ ’انما بعثت بالسیف‘ مجھے اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ساتھ تلوار بھی دی ہے۔ یہ حدیث دراصل سورۃ الحدید کی اس آیت کی تفسیر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ [الحدید ۵۷: ۲۵] یعنی ہم نے انبیاءؑ کو برحق کتابیں دے کر بھیجا، اور ہم نے لوہا بھی نازل کیا، یعنی قوت بھی ان کے ساتھ اتاری۔ ہمارے ایک استادِ محترم جو بعد میں شہید ہو گئے (اللہ ان کی مغفرت فرمائے) کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کو دو چیزیں دی تھیں: ایک کتاب اور دوسرا لوہا۔اب ہم مسلمانوں کی بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم نے کتاب کو تو بغل میں دبا لیا لیکن لوہے کو دشمن کے حوالے کر دیا، یوں اللہ تعالیٰ کا عطاء کردہ نسخہ آدھا کر دیا۔اب ظاہر ہے کہ نامکمل اور آدھے نسخے سے علاج ناممکن ہے، بیماری کا علاج پورے نسخے میں ہے، اور پورا نسخہ یہ ہے کہ قرآن بھی پڑھا کرو اور اس کے ساتھ ساتھ تلوار اور قوت بھی حاصل کرو۔

اسی ضمن میں ایک اور بات بھی سن لیجیے! کسی زمانے میں ایک بادشاہ یا گورنر ہوا کرتا تھا جس نے اپنی بیٹی کی تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی، وہ بچی جب قرآن مجید کی تلاوت کرتی تھی تو ایک چھوٹی سی تلوار قرآن مجید کے قریب رکھ دیا کرتی تھی اور تلاوت کے بعد قرآن مجید کو طاق

میں بھی تلوار کے ساتھ ہی رکھ دیتی تھی۔ کسی نے پوچھا کہ تم تو ابھی بچی ہو اور عورت ذات بھی ہو پھر قرآن پڑھتے ہوئے ساتھ تلوار کیوں رکھا کرتی ہو؟ اس نے جواب دیا: میں دنیا کو پیغام دینا چاہتی ہوں کہ اس قرآن کی اگر حفاظت کرنا چاہتے ہو تو پھر تلوار ہی کے ذریعے اس کی حفاظت کرو گے ورنہ اگر تلوار دشمن کے ہاتھ میں پہنچ گئی اور قرآن آپ کے پاس رہ گیا تو پھر اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ تم نے قرآن مجید کو ضائع کر دیا۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ اپنے کلام میں اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایں دو قوت حافظ یک دیگرند
کائناتِ زندگی را محورند

یہ دو طاقتیں ایک دوسرے کی حفاظت کرتی ہیں، چنانچہ تلوار قرآن مجید کو ضائع ہونے سے بچاتی ہے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں قرآن کے فلاں حصوں کو مانتا ہوں اور فلاں کو نہیں۔ اسی طرح قرآن مجید تلوار کو ظلم کا آلہ بننے سے بچاتا ہے، جس کے پاس تلوار تو ہو لیکن قرآن موجود نہ ہو تو وہ دنیا کو ظلم سے بھر دے گا۔ آپ دیکھیں! آج کل یہودیوں نے فلسطین میں کیسا ظلم کا بازار گرم کیا ہوا ہے؟ وہ کیوں ایسا کر رہے ہیں؟ کیونکہ ظلم سے روکنے والی چیز قرآن مجید ہے جو ان کے پاس نہیں ہے۔ اس پوری کائنات کا محور اور مرکزی نقطہ یہی دو باتیں ہیں جن کے گرد یہ کائنات گھومتی ہے۔

مومناں را تیغ با قرآن بس است
سطوتِ مارا ہمیں سامان بس است

بیت المقدس کا تاریخی پس منظر

بیت المقدس اور فلسطین پر جو مختلف مراحل گزرے ہیں اس حوالے سے اختصار کے ساتھ چند باتیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں یہ سرزمین تو اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے لیے لکھ دی تھی جیسا کہ سورۃ المائدۃ میں ہے: ﴿یٰقَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَۃَ الَّتِیۡ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمۡ﴾ [المائدہ۵:۲۱] موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ ’’اے میری قوم اس پاک سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے‘‘۔ اب جب یہ زمین اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے لکھ دی ہے تو تم مسلمان ان سے چھین کیوں رہے

ہو؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ کیا اس آیت کا یہی مفہوم حضرت عمرؓ کو بھی معلوم تھا یا آج آپ پر ہی اس کا انکشاف ہوا؟ حضرت عمرؓ نے جب ۱۶ ہجری میں فلسطین کو فتح کیا (تب وہاں یہودیوں کی نہیں بلکہ عیسائیوں کی حکومت تھی، اور انہی کے قبضے سے فلسطین کو آزاد کیا گیا تھا) تو عیسائیوں کو چاہیے تھا کہ وہ حضرت عمرؓ کو اس آیت کا حوالہ دے کر کہہ دیتے کہ یہ سرزمین تو اللہ نے یہودیوں کے لیے لکھ دی ہے، پھر تم ان سے کیوں چھین رہے ہو؟ اسی طرح جب صلاح الدین ایوبیؒ نے بیت المقدس کو فتح کیا تب بھی کسی عالم نے اٹھ کر انہیں یہ بات کیوں یاد نہیں دلائی؟ پس معلوم ہوا کہ آیت کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ سرزمین لکھ دی تھی تب وہ لوگ مسلمان تھے، (یعنی جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو یہ بات ارشاد فرما رہے تھے، اس وقت ان کی قوم مسلمان تھی،) اور یہ سرزمین انہیں بحیثیت ایک مسلمان قوم کے دی گئی تھی، نہ کہ بحیثیتِ بنی اسرائیل۔ لہٰذا یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سرزمین مسلمانوں کے لیے لکھ دی تھی، اب چونکہ یہودی مسلمان ہی نہیں رہے تو ان کا حق بھی ساقط ہو گیا۔ وہ یہود جنہوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل تک کر دیا، جنہوں نے کتاب اللہ میں تحریفیں کر دیں، وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی باتوں کو سن اور سمجھ لینے کے باوجود ان میں تحریفات کر دیتے تھے، تو کیا اللہ تعالیٰ نے ایسے کفار کو یہ سرزمین بطور انعام دی کہ خواہ تم کافر ہی کیوں نہ بن جاؤ پھر بھی تم اس سرزمین کے حق دار رہو گے؟ صحیح بات یہی ہے کہ اس وقت چونکہ یہ لوگ مسلمان تھے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بحیثیت مسلمان یہ سرزمین انہیں دے دی تھی، پھر جب یہ لوگ اسلام کا راستہ چھوڑ گئے تو اب اس سرزمین پر ان کا کوئی حق نہیں رہا، اب جو قوم مسلمان ہو گی وہی اس کی حق دار بھی ہو گی۔

۳۔ ان یہودیوں کے بارے میں قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا تھا: ﴿لَتُفۡسِدُنَّ فِي الۡاَرۡضِ مَرَّتَيۡنِ﴾ [الاسراء ۱۷: ۴] تم لوگ دو بار زمین میں فساد مچاتے اور بغاوتیں برپا کرتے رہو گے اور اس جرم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ تمہیں سزائیں دیتا رہے گا۔ منجملہ ان سزاؤں کے ایک یہ بھی ہو گی کہ بیت المقدس تم سے دوسرے لوگ چھین لیں گے۔

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے 600 سال قبل بابل (جو کہ اب عراق میں شامل ہے) کے بادشاہ بخت نصر نے آ کر ان یہودیوں کو سزا دی۔ اس نے وہاں موجود تمام یہودیوں کا قتل عام کر دیا، بے شمار یہودیوں کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ اس نے بیت

المقدس کو تباہ و برباد کر کے اس پورے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور یہاں سلیمان علیہ السلام کے زمانے سے جتنے خزانے موجود تھے وہ سب کچھ لوٹ کر لے گیا۔ چنانچہ یہود سو سال تک بابل میں قید کی زندگی گزارتے رہے۔ پھر ایک ایرانی بادشاہ جس کا نام سائرس ایرانی یا خورس ایرانی تھا، اس نے ان یہودیوں کو دوبارہ بیت المقدس میں آباد ہونے کی اجازت دی اور یہ لوگ وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ بعد میں بیت المقدس پر رومیوں نے قبضہ کر لیا اور یہود ان کی ماتحتی میں زندگی گزارنے لگے۔ جس عہد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت ملی اس وقت بھی یہ سارا علاقہ رومیوں کے قبضے میں تھا اگرچہ یہودی اس علاقے میں اس وقت رہائش پذیر تھے لیکن اقتدار رومیوں ہی کے پاس تھا۔ رومی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع الی السمآء کے 225 سال بعد عیسائیت اختیار کر کے عیسائی بن گئے (اگرچہ صحیح بات یہی ہے کہ عیسائیت رومی بن گئی تھی لیکن تاریخ میں لوگوں نے یہی لکھا ہے کہ رومی عیسائی بن گئے، اس موضوع پر تفصیلات کسی اور موقع پر پیش کریں گے۔) رفعِ عیسیٰ علیہ السلام کے تقریباً 70 سال بعد یہاں یہودیوں اور رومیوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے اور یہودیوں نے ان کے خلاف بغاوت اختیار کی۔ چنانچہ رومیوں نے یہودیوں کو مار مار کر انہیں دنیا میں تتر بتر کر دیا۔ اسی زمانے سے یہودی تمام دنیا میں دربدر ہو کر منتشر ہو کر رہنے لگے۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے 70 سال بعد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے 500 سال قبل فلسطین سے یہودیوں کو نکال کر باہر کر دیا گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فلسطین کو یہودیوں کے قبضے سے نہیں بلکہ عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کیا تھا (اس ضمن میں ایک اور بات بھی آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ 70 عیسوی میں جب رومیوں نے فلسطین پر قبضہ کیا تو انہوں نے بعد میں 135ء میں یہ اعلان کیا کہ آئندہ اس علاقے میں کوئی یہودی نہیں رہ سکے گا۔ فلسطین میں یہودیوں پر پہلی پابندی رومیوں کے اس قبضے کے بعد رومیوں نے لگائی تھی۔ اس کے بعد یہودی پوری دنیا میں تتر بتر ہو گئے، اسی کے بارے میں قرآن فرماتا ہے: ﴿وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ﴾ کہ اب تم لوگ زمین میں منتشر رہو ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴾ [الاسراء ۱۷: ۱۰۴] جب قیامت قریب آجائے گی تو پھر ہم تمہیں ایک جگہ جمع کر دیں گے۔ (اب جو اللہ تعالیٰ نے انہیں یہاں ایک ساتھ جمع کر دیا ہے تو صرف سزا دینے کے لیے)۔

حضرت عمرؓ کے بعد 1099ء کے زمانے میں یہاں مسلمان آپس میں مختلف ہو گئے۔

اہل مصر، اہل شام اور فلسطینی لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جنگیں لڑنے لگے۔ ان کی باہمی چپقلش سے عیسائیوں نے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپس میں اتحاد کرلیا اور حملہ کر کے بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھین لیا۔ یہ سارا کام انہوں نے بڑی آسانی کے ساتھ سرانجام دیا۔ قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے وہاں قتل عام برپا کر دیا اور بڑی تباہی کر دی۔ بعد ازاں نورالدین زنگیؒ نے جو کہ شام کا ایک حکمران تھا، فلسطین کو عیسائیوں سے واپس لینے کے لیے اقدامات شروع کر دیئے، وہ تو اپنی زندگی میں اپنے خواب کو شرمندہ تعبیر نہ کر سکا البتہ انہوں نے مسجد اقصیٰ میں نصب کرنے کے لیے ایک منبر تیار کروالیا تھا جسے ان کے شاگرد صلاح الدین ایوبیؒ نے بیت المقدس فتح کرنے کے بعد 1187ء میں وہاں نصب کر دیا، تقریباً 90 سال تک بیت المقدس عیسائیوں کے زیر قبضہ رہا۔

صلاح الدین ایوبیؒ کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ برطانیہ پر قبضہ کرے۔ رچرڈ شیر دل کو اس منصوبے کا پتہ چل گیا۔ اس نے 8 سال تک سازشیں کر کے صلاح الدین ایوبیؒ کو مسلمانوں کے ساتھ ہی برسرِ پیکار رکھا تاکہ وہ دلجمعی کے ساتھ کوئی کام نہ کر سکے۔ بالآخر اس نے فرانس اور سپین وغیرہ ممالک سے بحری بیڑے جمع کر کے ایک بڑا لشکر تشکیل دے دیا اور صلاح الدین ایوبیؒ کے خلاف بڑی جنگ لڑی اور شکست کھا گیا، نتیجتاً صلاح الدین ایوبیؒ نے بیت المقدس کو آزاد کرالیا۔ اس کے بعد بیت المقدس مسلمانوں کے پاس رہا یہاں تک کہ 1915ء میں جنگ عظیم اول شروع ہوگئی۔ برطانیہ اور جرمنی کے درمیان جنگ جاری تھی، اس وقت برطانیہ نے سازش کی تاکہ سلطنت عثمانیہ کو بھی اس جنگ میں شامل کر دے حالانکہ ان کی کوئی دلچسپی اس جنگ میں نہیں تھی، بہر حال برطانیہ انہیں اس جنگ میں کھینچ لانے میں کامیاب ہو گیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جب عثمانی سلطنت اس جنگ میں شریک ہو جائے گی تو ہمیں ان کے خلاف فضاء ہموار کرنے اور ان کے خلاف کاروائیاں کرنے کے لیے موقع مل جائے گا۔ برطانیہ نے عربوں کے ساتھ بات چیت کر کے انہیں قائل کرلیا کہ وہ برطانیہ کا ساتھ دیں اور بدلے میں ترکی حکومت عرب سرزمین سے ختم کر دی جائے گی۔ چنانچہ عرب وعجم کے درمیان جنگ اس بنیاد پر شروع کروادی کہ عجم کو عرب پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ برطانیہ نے عربوں کو مالی امداد بھی پہنچائی اور اپنے ایجنٹ بھی ان کے اندر پیدا کر دیئے جیسے لارنس

آف عریبیہ اور شریفِ مکہ وغیرہ جن کے قصے مشہور و معروف ہیں۔

اس دور میں یہودیوں نے تھیوڈر ہرٹزل کی زیر قیادت ایک تنظیم 'زائنسٹ موومنٹ' یعنی صہیونی تحریک کے نام سے 1897ء میں بنائی تھی جس کا مقصد اچھی طرح جان لینا چاہیے۔ ہمارے ملک میں Zionist Movement مختلف ناموں سے کام کر رہی ہے، عام طور پر اس کا نام 'فری میسن تنظیم' ہے، یہ یہودیوں کی تنظیم ہے جس کا واحد مقصد یہ ہے کہ بیت المقدس مسلمانوں سے لے لیا جائے اور وہاں ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے۔ سلیمان علیہ السلام کے نام پر وہاں ایک بت خانہ بنایا جائے اور تمام دنیا اور بالخصوص مسلمانوں پر حکومت کی جائے اور دجال جسے وہ مسیحا کہتے ہیں، کی آمد کا انتظار کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے فلسطین کے قریبی علاقوں پر قبضہ کیا جائے جن میں مصر، اُردن، فلسطین، شام، عراق کا ایک بڑا حصہ، ترکی کا بڑا حصہ اور سعودی عرب کا بڑا حصہ یہاں تک کہ حجاز بھی اس میں شامل ہے۔ یہ ان کا منصوبہ ہے اور یہی فری میسن کا بنیادی مقصد ہے۔ اس سلسلے میں آپ ایک کتاب Hitchcock کی شیطانی سنیا گاگ کا مطالعہ کریں جس کا اردو ترجمہ 'شیطانی کنیسہ' کے نام سے (Satanic Synagogue) موجود ہے۔ اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ 1907ء میں روسی انقلاب بھی دراصل انہی فری میسن نے برپا کیا تھا۔

ان کی ایک اور تنظیم ہے جسے 'روٹری کلب' کہتے ہیں۔ آپ کے علاقے پشاور میں بلکہ اسی حیات آباد میں ایسے لوگوں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں جو اس تنظیم کے باقاعدہ رکن ہیں۔ ایک صاحب کے گھر میں مَیں نے اپنی آنکھوں سے اس کے مخصوص نشان دیکھے ہیں، حالانکہ موصوف اچھا بھلا صوم وصلاۃ کا پابند بھی ہے، پوچھنے پر انہوں نے اعتراف کیا کہ میں روٹری کلب کا ممبر ہوں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ روٹری کلب کیا چیز ہے؟ یہ دراصل فری میسن ہی کا حصہ ہے، یہ لوگ مسلمانوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر انہیں مختلف ناموں سے گھیر لیتے ہیں اور پھر انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، جبکہ یہ غافل مسلمان اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کیونکہ انہیں تو بس شہرت، سیر و تفریح اور پیسہ چاہیے خواہ حلال ہو یا حرام، انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

بہرحال ان صہیونیوں نے برطانیہ کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کیا۔ معاہدہ یہ ہوا کہ یہودی برطانیہ کو جنگ میں مالی سپورٹ فراہم کریں گے جبکہ برطانیہ اس کے بدلے فلسطین کی سرزمین انہیں دلوا دے گا۔ اس وقت برطانیہ دنیا کی بہت بڑی قوت تھی۔ اس زمانہ میں ان کا سیکرٹری خارجہ (وزیر خارجہ کو وہاں سیکرٹری خارجہ کہتے ہیں) بالفور تھا، بعد میں وہ برطانیہ کا وزیر اعظم بھی رہا۔ 1917ء میں اسی بالفور کی جانب سے ایک خط جاری ہوا (جس کا اردو ترجمہ بھی دستیاب ہے) یہ خط روتھ شیلڈ کے نام لکھا گیا تھا (روتھ شیلڈ وہ یہودی خاندان ہے جو آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور دنیا کے مالیاتی اداروں پر قابض ہے۔) چنانچہ برطانوی وزیر خارجہ 1917ء میں اسی روتھ شیلڈ کو خط لکھتا ہے کہ 'زائنسٹ موومنٹ' والوں کو اطلاع دے دو کہ ہم نے فلسطین میں آپ کی قومی ریاست بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

مختلف طریقوں سے انہوں نے 1917ء میں یہ تحریک شروع کردی، 1917ء سے 1922ء تک فلسطین میں برطانیہ کا انتداب یعنی انہی کا مینڈیٹ اور اختیار تھا، اُس وقت اقوام متحدہ کا وجود نہیں تھا بلکہ لیگ آف نیشنز تھی۔ لیگ آف نیشنز نے برطانیہ کے ذمہ لگایا کہ فلسطین کا علاقہ تم سنبھال لو کیونکہ جنگ عظیم اول میں انہوں نے ترکی سے فلسطین کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا، لہٰذا اختیارات بھی انہی کو منتقل کردیے گئے۔ ان اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے برطانیہ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یہودیوں سے کہا کہ تم لوگ تیار ہوجاؤ یہ علاقہ ہم تمہارے لیے مختص کررہے ہیں اور یہ علاقہ آپ کا قومی وطن ہوگا۔ اس کے بعد برطانیہ نے فلسطین میں جو کمشنرز مقرر کرنے شروع کردیے وہ سارے یہودی تھے۔ پروپیگنڈہ تو یہ کیا جاتا ہے کہ فلسطینیوں نے خود ہی اپنی جائیدادیں یہودیوں کے ہاتھ فروخت کردی تھیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اس کا کوئی ثبوت بھی تو پیش کرو! مجھے تو ڈھونڈھنے سے بھی کوئی ثبوت نہیں مل سکا ہے۔ ہاں یہ ثبوت مل گیا کہ مسجد اقصیٰ میں داخلی دروازے پر ایک بازار آتا ہے، اس بازار میں ایک چھوٹی سی دکان ہے جس میں ایک غریب مسلمان دوکاندار نے چند پرانی چادریں لٹکائی ہوئی ہیں اور بس، یہودیوں نے آکر اس سے کہا کہ ہم تمہیں 15 ملین ڈالر اس دکان کے بدلے دیتے ہیں، آپ اسے ہمیں فروخت کردیں، اتنی بڑی رقم سے آپ کسی اور جگہ پوری مارکیٹ بھی خرید سکتے ہیں اور اپنا ذاتی کاروبار بھی کھڑا کرسکتے ہیں، اس نے بلاتوقف جواب دیدیا کہ

میں بیت المقدس کو یہودیوں کے ہاتھ کبھی نہیں بیچوں گا خواہ مجھے بھوک اور پیاس برداشت کرنا کیوں نہ پڑے، ہاں اگر مجھے مروانا چاہتے ہو تو ماردو۔ عین ممکن ہے کہ یہودی اس کو قتل کر کے بزور اس سے اس کی وہ دکان چھین لیں لیکن اپنی مرضی سے تو اس نے اپنی جائیداد فروخت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لہٰذا فلسطینیوں پر یہ جھوٹا الزام ہرگز نہ لگائیں کہ انہوں نے خود اپنی جائیدادیں یہودیوں کو فروخت کر کے اسرائیلی ریاست بنانے میں تعاون کیا ہے۔

اسرائیل کا اعلان 14 مئی 1948ء کو ہوا اس سے ایک ماہ قبل 19 اپریل 1948ء کا واقعہ ہے، کہ یہودیوں نے اقوام متحدہ اور برطانیہ کے پیسوں کے بل بوتے پر مسلمانوں کی زمینیں ہتھیانی شروع کر دیں، دیرِ یاسین نامی علاقے کے لوگوں نے اپنی جائیدادیں ان کے ہاتھوں بیچنے سے انکار کر دیا تھا، (دیر معبد کو کہتے ہیں) چنانچہ اس علاقے کے مسلمانوں پر یہودیوں نے اتنے حملے کیے کہ ان کے سارے مرد شہید کر دیئے گئے، یہودیوں نے بچ جانے والی خواتین کو ننگا کر کے ان کا جلوس نکالا اور تمام لوگوں کو پیغام دیا کہ جو اپنی جائیدادیں ہمیں فروخت نہیں کریں گے ہم ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں گے۔

بعض نادان لوگ کہتے ہیں کہ جب مسلمان کمزور ہیں اور دشمن کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے تو پھر خواہ مخواہ مزاحمت کر کے اپنے لیے مصیبت کیوں مول لیتے ہیں؟ چند راکٹ فائر کر کے بعد میں اپنے بچوں کو مروا دیتے ہیں۔

ان عقل کے اندھوں سے ہم یہ کہتے ہیں کہ کیا تم اس بات کی گارنٹی دے سکتے ہو کہ اگر حماس کے مجاہدین جنگ بندی کر دیں تو یہودی اپنی ان ذلیل حرکتوں سے باز آ جائیں گے؟ مذکورہ بالا واقعہ 1948ء کا ہے۔ تب کس نے یہودیوں پر حملہ کیا تھا یا کس نے ان پر راکٹ فائر کیا تھا؟ دراصل فلسطینیوں کا واحد جرم یہ تھا کہ وہ اپنی جائیدادیں یہودیوں کو فروخت نہیں کرنا چاہتے تھے جبکہ یہودی ان سے بزور لینا چاہتے تھے کہ یا تو اپنی مرضی سے فروخت کر دو ورنہ ہم آپ سے بزور جائیدادیں بھی لیں گے اور تمہیں اور تمہارے رشتہ داروں کو قتل بھی کریں گے اور تمہاری عورتوں کا ننگا جلوس بھی نکالیں گے۔ کیا یہ سارا کچھ اس وجہ سے ہوا تھا کہ فلسطینیوں نے یہودیوں پر راکٹ برسائے تھے؟ (جاری ہے)

the state the *Mukhliseen-e-Deen* remain powerless to influence governance structures in social order and to control capitalist individuation and socialization.

Alhamdulillah! we possess two Islamic states in Iran and Afghanistan (and other Islamic states will Insha'Allah emerge in Sahili Africa). Iran already has taken several steps to thwart infiltration of the cyber space by Big Tech. Afghanistan is also seeking to develop (in association with Iran expertise) to develop a proactive information protection policy. Both Islamic states must take action to develop indigenous platforms geared to serving Islamic objectives. Delinking with Big Tech should be seen as complementary effort at delinking from the *gharar* and *riba* based global financial system.

In non-Islamic Muslim states – such as Pakistan, Turkey and Indonesia, Islamic revolutionaries and Islamic community must recognize the danger of using imperialist funded digital platforms. We must remember that we triumphed in the Afghan jihad without a major use of digital technology and we frustrated imperialist surveillance efforts using digitalized technology.

Today in non-Islamic Muslim states IT use is widespread. Its most lethal means – the mobile cellular phone is immen popular. Most *madrasas* are offering computer training. Islamic parties are organizing career IT programs for members. All this is counter productive as it opens up activities to imperialist surveillance and sabotage. More importantly it accelerates the process of capitalist individuation and socialization in the country. Islamic identity consciousness cannot flourish if it is subjected to capitalist commodification. We must oppose these trends and craft a strateg to revert to mosque and community based communication networks.

to articulate the capital spirit (hirs and hasad). It significantly speeds up the process of capitalist individuation and socialization and impedes the growth of non-capitalist valuation system. It is unambiguously an evil force seeking domination over individuality and society.

Moreover Big Tech is an imperialist artifact. The internet is an invention of the US Department of Defense and the American imperialist state is the ultimate guarantor of Big Tech's global reach. Imperialist stooge agencies – WIPO and WTO – have crafted the intellectual property regulating regimes which undergirds Big Tech's systemic dominance. Big Tech is the main technical instrument servicing imperialist surveillance system.

Big Tech's systemic dominance represents a change in the structure of capitalist production and exchange – a change which widens the scope for the dominance of the capitalist spirit (*hirs* and *hasad*).

The Islamic Revolutionary Response

The domination of the capital spirit (hirs and hasad) at the individual and the social level can and should be resisted by Islamic revolutionary forces. This must not be accepted as inevitable, irreversible process.

Capitalist order is designed as an opaque system of power governance. But Islamic revolutionary acts can strategically penetrate this opaque veneer. Capital seeks to shield its power through network of procedures and institutions which are designed to control its brutal power.

The key instrumentality for deconstructing capitalist order is the Islamic state – as Maulana Maududi and Imam Khomeni (may Allah bless them) recognized several decades ago. The state is the means for contesting the growth of capitalist individuality and society – without the resources of

through the user network that Big Tech companies control and manipulate data extending the social space under Big Tech's control.

Digitalization, Capitalist Individuality and the State

The development of digital technology significantly affects the capitalist mode of production. It augments rent taking and appropriation of unpaid labor as a means of surplus extraction. Though the fundamental nature of the relationship between labour and management in the production process does not change. Big Tech employs hundreds of thousands of workers, invests billion of tangible assets and manages and controls both employed labour and invested fixed capital in the conventional way.

Does the partial – though growing – transition from profit to rent as a source of surplus extraction represent a change in capitalism's spirit?

Capital is essentially a spiritual – not a material process. It is a manifestation of the evil forces of *hirs* (avarice) and *hasad* (covetousness) which embeds itself in wealth and men's soul and circulates through them for never-ending self-expansion – as spiritual forces *hirs* and *hasad* (capital) know no limits. Throughout its history capital has grown by entrapping more and more men and women in the vicious grip of *hirs* and *hasad*.

Digitalization is a means for enhancing capitalist individuation and socialization. It strengthens capitalist individuation by entrapping millions of men and women in the circuit of capital (*hirs* and *hasad*) through constant commodification of their desires and consumption. The billions of users are its important workers supplying and utilizing capitalist services. It socializes personal interaction

command the quality of mankind's life. No form of life – activity, thought – escapes commodification by the Big Tech monopolization. Every moment of the individual's life is a moment of and for the Valuation of "intellectual" capital.

Digitalization effects the form of socialization. Digitalization does not commodifies in the traditional sense. Most services offered on the net are commodified at a secondary level through advertising. They entrap their users within a capitalist algorithmic loop. Digital platforms are ecosystems that manipulate social interactions on the basis of detected pattern of behaviour among unrelated people. Their output – given the users – and their input – the information the user provides – are indistinguishable. The wider the user web network the more effective the services provided. This induces the Big Tech service providers to offer free access to its services. This strengthens the social dominance of the Big Tech companies.

The success of the Big Tech companies is focused on enhancing social control. Their capacity to anticipate and influence behavior patterns is a function of the scope and amount of data collected. Data use is necessarily biased through the use of hidden criteria embedded in the articulation of the digital platform. This strengthens the monopolistic stronghold of Big Tech on individual consciousness.

Capitalism is evolving in such a way that Big Tech monopolists invest in and create mass intangible assets that generate new forms of social control. The expansion of their business gives Big Tech an unlimited access to social power. Data itself is not the source of this social power. It is the user metrics - number of users, level of interaction among them – that are the crucially important assets of Big Tech. It is

economy in the direction of dispossession and rent seeking?

Globalization, financialization, digitalization are all complementary aspects of the present day imperialist order. But Big Tech capitalism is creating a new world order when capitalism no longer extract surplus mainly through the production of basic mass consumed commodities alone but increasingly depends upon political intervention for surplus extraction. This political intervention by imperialist powers guarantees monopolization and increased financial speculation. Hence the universal imperialist emphasis on adherence to globally sanctioned standards and procedures regulating trade, finance and technology transfer within and across national frontiers.

In the new imperialist era dominated by Big Tech there is a policy preference for finance over production. Big Tech imperialism represents a retreat from production facilitated by politically enforced coercion and establishment of relations of appropriation. Subservience to Big Tech necessarily implies a loss of national sovereignty – except for those imperialist powers (effectively America and potentially China) which can guarantee the monopolistic global grip of Big Tech and are designing global transactional procedures to strengthen Big Tech monopolization.

Big Tech monopolization is its social monopolization of time. The web user is entrapped in Big Tech's monopolistic grip on a whole time basis. Big Tech commodifies time through the commodification of almost all aspects of individual and social life – religion, health, education and entertainment. All are turned into fictitious commodities. This leads to a near total loss of personal identity and the "autonomy" that capitalism is supposed to generate. Big Tech

Dr. Javed Akbar Ansari

Certainty and Change in Capitalist Order

Capitalism was born in the 11th century in some city states of Italy. Throughout its history it has undergone structural changes while remaining the same, as far as its spirit is concerned. This interplay of certainty and change is intensified in postmodern era.

Today's global capitalist economy is dominated by relative production stagnation, financialization and rapid increase in interpersonal and income and wealth distributional inequalities. Rapid digitalization has led to the macro/systematic dominance of small handful of tech giants conglomerates who appropriate surplus through fictitiously enhanced rents and monopolies, rather than through innovation. We are in the era of "intellectual monopoly capitalism".

The growth of monopoly power in the 21st century is not limited to Big Tech. Big Oil and Big Pharma companies are also increasing their monopoly in global markets but Big Tech is more resilient and capable of extending its tentacles much more widely, potentially dominate over most of global capitalist sectors. Web users seem to be lead to the dominant information service providers.

But if Big Tech depends on political support of the state, hasn't this always the case of capitalist history - the history of capitalism subsumes the history of imperialism since at least the fifteenth century? Can it be argued that Tech Giants are more effective imperialist forces – more effective than imperialist armies, navies and Air force – pushing the global